www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

May 2006 • No. 354



دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-13
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 110,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

مئی 2006

فہرست

مثبت شخصیت کی تعمیر

روسو (Jean Jacques Rousseau) فرانس کا مشہور جمہوری مفکر ہے۔ وہ ۱۷۱۲ میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ شخصی بادشاہت کے مقابلے میں عوامی حکمرانی کا علم بردار تھا۔ وہ اپنی مشہور کتاب معاہدۂ عُمرانی (Social Contract) کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے— نسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chain.

مگر انسان کا ایک اور مسئلہ ہے جو شاید اس سے بھی زیادہ سنگین ہے، اور وہ کنڈیشننگ ہے۔ ہر عورت اور مرد کسی ماحول میں رہتے ہیں۔ ماحول کی نسبت سے ہر ایک کے ذہن کی کنڈیشننگ ہو جاتی ہے جو اس کو صحیح طرزِ فکر سے محروم کر دیتی ہے۔ آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ فطری انداز میں سوچ سکے۔ اِس مسئلے کو دیکھتے ہوئے روسو کے جملے کو زیادہ بہتر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ— انسان فطرت پیدا ہوا تھا، مگر وہ ہر جگہ کنڈیشنڈ دکھائی دیتا ہے:

Man was created on divine nature, but
I see him psychologically conditioned.

ایک بچہ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اس وقت اس کو دیکھیے تو وہ معصومیت کا پیکر دکھائی دے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ فرشتے نے انسان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پیدائش کے وقت انسان اپنے ذہن کے اعتبار سے خالص ذہن کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی سوچ عین وہی فطری سوچ ہوتی ہے جو بطور واقعہ ہونا چاہیے۔ مگر انسان ایک سماجی حیوان (social animal) ہے۔ اس کو اپنی ساری زندگی دوسروں کے بنائے ہوئے سماج کے اندر گذارنا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس کا ذہن ہر آن خارجی تأثر قبول کرتا رہتا ہے۔ جس کو کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ یہ تاثر پذیری بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ انسان مکمل طور پر کنڈیشننگ کا کیس بن جاتا ہے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہر عورت اور مرد کی یہ لازمی ذمّے داری ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ کو سمجھے اور اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کرکے دوبارہ اپنے آپ کو حالتِ فطری کی طرف واپس لے جائے، وہ اپنے آپ کو انسانِ مصنوعی کے بجائے انسانِ فطری بنائے۔

موجودہ زمانے میں علمِ نفسیات میں ایک نظریہ بہت عام ہوگیا ہے جس کو بہیویرازم (behaviourism) کہا جاتا ہے۔نفسیات کے اس مدرسۂ فکر میں یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ کنڈیشننگ ہی انسان کی مستقل حالت ہے، انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے کچھ نہیں، یہ دراصل ماحول کی کنڈیشننگ ہے جو انسان کی شخصیت سازی کرتی ہے۔اس نظریے کے حاملین کہتے ہیں کہ انسان نیچر (nature) سے نہیں بنتا۔ بلکہ وہ نرچر (nurture) سے بنتا ہے۔یعنی ماحول کی پرورش سے۔اس نفسیاتی مدرسۂ فکر کے لوگ کہتے ہیں کہ — انسان جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں کے حالات اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں:

He was nurtured when he was born. (Wotton)

انسانی شخصیت کی زیادہ گہری تحقیق اس نظریے کو رد کررہی ہے۔زیادہ گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک مکمل شخصیت ہوتا ہے۔ جنیٹک کوڈ کی حالیہ دریافت مذکورہ نظریے کی مکمل تردید ہے۔اس دریافت کے ذریعے یہ ثابت ہوا ہے کہ جنیٹک کوڈ کے اندر پیدائشی طور پر ہر انسان کی مکمل شخصیت موجود ہوتی ہے۔ بعد کے دور میں انسان کی جو شخصیت بنتی ہے، وہ اسی جنیٹک کوڈ کی صرف اَن فولڈنگ (unfolding) ہے۔

اِس نقطۂ نظر کے مطابق، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ماحول کی کنڈیشننگ اصل انسان کے اوپر ایک مصنوعی پردے کی حیثیت رکھتی ہے۔گویا انسان کی شخصیت پیاز کی مانند ہے۔ پیاز کے اندر مٹر کی مانند ایک مغز ہوتا ہے۔اس داخلی مغز کے اوپر خارجی پردے کے مانند بہت سے چھلکے ہوتے ہیں۔اگر ان چھلکوں کو ہٹایا جائے تو پیاز کا اندرونی مغز کھل کر سامنے آجائے گا۔یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی شخصیت کے اوپر ماحول کے اثر سے مصنوعی پردے پڑ جاتے ہیں۔ان پردوں کو ہٹادیا جائے

تو انسان کی اصل شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

انسانی شخصیت کے انھیں خارجی پردوں کو ہٹانے کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ جو آدمی سچائی کا طالب ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ کرکے مصنوعی پَردوں کو ختم کرے تاکہ اس کی اصل شخصیت سامنے آسکے۔

مذہب میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی خاص تخلیق ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی خدائی شخصیت (Divine Personality) پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے داخلی وجود کے اعتبار سے ایک صحیح اور کامل شخصیت ہوتا ہے۔ ابدی کامیابی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنی اس فطری شخصیت کی حفاظت کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس حالتِ فطری پر قائم کرے جس پر اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اسی خودتعمیری جدوجہد کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جب ایک ماحول میں پرورش پاتا ہے تو ہر دن اس کے ساتھ مختلف منفی تجربے پیش آتے ہیں۔ یہ تجربے اس کی اصل شخصیت پر غیر مطلوب پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اس کے مقابلے میں زیادہ ترقی کر گیا۔ یہ تجربہ اس کے اندر حسد کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کے اندر حسد کا ایک عنصر شامل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اس کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں نفرت کا ایک عنصر شامل کردیتا ہے۔ ایک مشاہدہ اس کے سامنے آتا ہے اس کو دیکھ کر اس کے اندر وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو لالچ کہا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں لالچ کا ایک عنصر داخل کردیتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اس کے ساتھ ظلم کا معاملہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کے اندر تشدد کا جذبہ جگاتا ہے، اور اس کی شخصیت میں تشدد کا عنصر شامل ہوجاتا ہے۔

اس طرح ماحول کے اندر آدمی کو مختلف قسم کے تجربات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے، اور ہر تجربہ ایک منفی عنصر بن کر اس کی شخصیت کی تشکیل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی اصل شخصیت پردوں میں ڈھک جاتی ہے۔ انسانِ فطری بدل کر انسانِ مصنوعی بن جاتا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ اسی مصنوعی صورتِ حال کی تصحیح ہے۔ یہ ڈی کنڈیشننگ ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔اس کے بغیر انسان کی شخصیت ایک ناقص شخصیت بنی رہے گی، وہ کبھی کامل شخصیت کادرجہ نہ پاسکے گی۔

اس ڈی کنڈیشننگ کا بنیادی ذریعہ احتساب خویش (introspection) ہے۔ ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اندر سے ہر منفی آئٹم کو نکالے اور اس کو فکری تصحیح کے عمل سے گذار کر مثبت آئٹم بنائے۔ اور پھر اسی مثبت آئٹم کو اپنی شخصیت میں واپس داخل کرے۔ جس طرح مویشی جگالی کرکے اپنے اندر سے غیر ہضم شدہ غذا کو نکالتے ہیں اور پھر اس کو قابل ہضم بنا کر اپنے پیٹ میں دوبارہ داخل کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ڈی کنڈیشننگ کے ذریعے اپنی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کریں۔

نفسیات کا مطالعہ بتا تا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے ہیں—— شعور اور لاشعور۔ انسان کے ساتھ جب کوئی ناخوشگوار تجربہ گذرتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس کے ذہن کے شعوری خانے میں ایک منفی آئٹم کے طور پر داخل ہوتا ہے۔ یہ منفی آئٹم چند دن تک زندہ شعور کے خانے میں رہتا ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ اس کے لاشعور کے خانے میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کا حصہ بن جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی پہلے ہی دن یا چند دن کے اندر ہر منفی آئٹم کو مثبت آئٹم میں تبدیل کرے۔ تا کہ یہ آئٹم جب زندہ شعور سے گذر کر اس کے لاشعور میں یا حافظے کے اسٹور میں پہنچے تو وہ ایک مثبت آئٹم کے طور پر وہاں محفوظ ہو۔

یہی وہ عمل ہے جو انسانی شخصیت کی تعمیر میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عمل کے دوران یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان منفی شخصیت کا حامل ہو یا مثبت شخصیت کا حامل۔

جو آدمی اپنے روز مرّہ کے تجربات پر تصحیح کا عمل کرکے اس کو مثبت آئٹم میں ڈھالتا رہے، اس کے لاشعور یا حافظے کے اسٹور میں تمام آئٹم مثبت آئٹم کے طور پر جمع ہوں گے۔ ایسے انسان کی شخصیت ایک مثبت شخصیت ہوگی۔ اس کے برعکس جو انسان تجربے کے پہلے ہی مرحلے میں تصحیح کا یہ عمل جاری نہ

کر سکے اس کو پیش آنے والے تمام منفی آئٹم اس کے لاشعور کے خانے میں صرف منفی آئٹم کے طور پر جگہ پائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی پوری شخصیت ایک منفی شخصیت بن جائے گی۔

انسان جو بھی عمل کرتا ہے، خواہ وہ اس کی سوچ ہو یا وہ اس کا قول ہو یا وہ اس کا عمل، سب کچھ اس کے لاشعور کے تحت ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے شعور کے کم اور اپنے لاشعور کے زیادہ تابع ہوتا ہے۔ جس انسان کا لاشعور منفی آئٹم کا ذخیرہ بن جائے، اس کے تمام اقوال و اعمال منفی نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے برعکس، جس انسان کا لاشعور خود تعمیری کے نتیجے میں مثبت آئٹم کا ذخیرہ بنا ہوا ہو، اس کے تمام اقوال و اعمال صحت منداور مثبت انداز کے حامل ہوں گے۔

حق کی تلاش یا حق کی یافت دونوں ہی مثبت شخصیت کا فعل ہیں۔ یہ دراصل مثبت شخصیت ہے جس کے اندر تلاشِ حق کا اعلیٰ جذبہ جاگتا ہے۔ اور یہ مثبت شخصیت ہی ہے جو اپنی سلامتِ فکر کی بنا پر آخر کار حق کی یافت کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔

حقیقت کی دریافت

Discovering the Truth

انسان ایک متلاشیٔ حق حیوان ہے(Man is a truth-seeking animal)۔ میں نے خود اپنی ذات میں اس کا تجربہ کیا ہے۔ میرے اندر بچپن سے سچائی کی تلاش کا جذبہ کسی نہ کسی طرح موجود تھا۔ ۱۹۴۲ میں یہ جذبہ پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا۔ اُس زمانے میں میرا حال یہ تھا کہ میں جنگلوں اور ویرانوں میں چلا جاتا اور تنہائی میں رو رو کر یہ کہتا کہ: ’’خداوند، تو کب آئے گا۔ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں‘‘۔

آخر کار ایک خدائی کلام میں مجھے اس کا جواب ملا۔ اس کے مطابق، خدا نے فرمایا ہے: **کنتُ کنزاً مخفیّا فاردتُ ان اُعرف فخلقت الخلق** (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں۔ پھر میں نے انسان کو پیدا کیا)۔ اس ارشاد کے مطابق انسان کا مقصد وجود یہ ہے وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے۔ اور اس معرفت کی قیمت میں وہ ابدی جنت میں جگہ پائے۔ موت کے پہلے کا دورِ حیات حصولِ معرفت کا دَور ہے اور موت کے بعد کا دَورِ حیات آرام اور راحت کی ابدی جنت کی دنیا میں زندگی گذارنے کا دَور۔

یہ معرفتِ رب کوئی سادہ چیز نہیں۔ یہ ایک مشکل ترین مہم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدائی دَورِ حیات میں انسان کے رہنے کے لیے خدا نے جو دنیا بنائی وہ مکمل طور پر شبہات سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے ہر جُز میں ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) پایا جاتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی فکری یا عملی چیز ایسی نہیں جو شبہہ سے خالی ہو۔ موت سے پہلے کے اِس دَورِ حیات میں انسان کا کام یہ ہے کہ وہ شبہات کے پردے کو پھاڑ کر حقیقت کو دیکھے، وہ شبہات کے باوجود کامل یقین کا درجہ حاصل کرے۔

دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب پر شبہات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہی اپنے

آپ کو اَفکار کے ایک جنگل میں پاتا ہے۔ زندگی کے بارے میں مختلف قسم کے فلسفے اس کو حیرانی کا تحفہ دیتے ہیں۔ یہاں درجنوں مذاہب ہیں اور ہر مذہب اپنے بارے میں سچا ہونے کا دعویٰ کررہا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر جذبات وخواہشات کا ایک طوفان لیے ہوئے ہے جو خالص عقلی رویّہ اختیار کرنے میں مسلسل رکاوٹ بنتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ خاندانی اور سماجی بندھن میں پھنسا ہوا ہے۔ ہر آدمی مفادات کے خول میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی عادتیں اور رجحانات اس کو اپنے ساتھ باندھے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی مال واولاد، اور رشتے داروں کے جال میں اس طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایسی حالت میں سچائی کی معرفت صرف اُس انسان کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اندر موضوعی طرزِ فکر (objective thinking) کی تشکیل کرسکے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرسکے کہ وہ شبہات کے پردے کو پھاڑ کر حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں دیکھے۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔

اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ صلاحیت ہو جس کو انقلابی صلاحیت (revolutionary nature) کہا جاتا ہے۔ یعنی جب ایک بات سمجھ میں آجائے تو کسی بھی مصلحت کی پَروا کیے بغیر وہ کھُلے طور پر اس کو قبول کرلے۔ وہ اپنی زندگی کا رُخ بدل کر دریافت شدہ حقیقت کو اپنی زندگی کا نشانہ بنالے۔

شبہات کے اِس پَردے کو پھاڑنے کا ذریعہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے خالق کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کو جاننا۔ یہ تخلیقی منصوبہ چیزوں کی اس طرح توَجیہہ کردیتا ہے کہ شبہات کے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقیقت اسی طرح نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے جس طرح کالے بادل چھٹنے کے بعد روشن سورج سامنے آجاتا ہے۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ اِس تخلیقی منصوبے کا کلیدی پہلو یہ ہے کہ انسان کو ہر قسم کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور پھر اس کو مکمل طور پر آزاد کردیا گیا ہے۔ اب انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صرف صحیح طور پر استعمال کرے، وہ اپنی آزادی کا کبھی غلط استعمال (misuse) نہ کرے۔

اِسی استعمال کے اوپر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ آزادی کا صحیح استعمال کرنے والوں کے لیے جنت ہے اور آزادی کا غلط استعمال کرنے والوں کے لیے جہنم۔ اِس آزادی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے مسابقت اور چیلنج پیدا ہوتا ہے اور مسابقت اور چیلنج کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔

فلسفے میں انسان اور خدا کی نسبت سے سب سے زیادہ قابلِ بحث سوال وہ رہا ہے جس کو بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی دنیا میں اتنی زیادہ مصیبت (suffering) کیوں ہے۔ خدا اگر مکمل خوبی ہے تو اس نے ایسی دنیا کیوں بنائی جہاں انسان طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہے۔

خدا کے تخلیقی نقشے کو سمجھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ یہ تمام مصیبتیں کسی نہ کسی پہلو سے آزادی کے غلط استعمال کی قیمت ہیں۔ یہ قیمت بظاہر ایک بہت سخت قیمت ہے لیکن خدا کی طرف سے یہ خوش خبری ہے کہ موت کے بعد جب یوم الحساب (Day of Judgement) آئے گا تو خدا کسی انسان کو اس کے صرف اُس عمل پر پکڑے گا جس میں یہ ثابت ہو کہ آدمی نے اپنی ملی ہوئی آزادی کا استعمال کیا تھا۔ اس کے سوا خالق کے تخلیقی نقشے کی بنا پر کسی کو جو مصیبت پیش آئے گی اُس کے لیے ایسی تلافی (compensation) کا انتظام کردیا جائے گا کہ وہ بلا اشتباہ یہ سمجھ لے گا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ عین انصاف کا تقاضا تھا۔ مزید یہ کہ یہ مصیبت ایک اعتبار سے شاک ٹریٹمنٹ (Shock treatment) ہے۔ کیوں کہ وہ انسان کے لیے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔

سفرنگ کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں ہے کہ اپنے ذہنی قیاس کے تحت اس پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کو تاریخ انسانی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کی ترقی کے لیے زیادہ بڑا عامل آرام نہیں ہے بلکہ مصیبت ہے۔ آرام میں انسان کی صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، مصیبتوں میں جو انسان بنتے ہیں وہ زیادہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

It is not ease but effort, not facility but difficulty that makes men.

مغرب کے ترقی یافتہ سماجوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہاں ایک نئی ’’بیماری‘‘ پیدا ہوئی ہے جس کو افلوئنزا (affluenza) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ خوش حال طبقے کی بیماری ہے۔ خوش حال گھرانوں میں ذہنی سورماؤں کے بجائے ذہنی بونے (intellectual dwarf) بن رہے ہیں۔ ان کا آئی کیو (IQ) بہت کم ہوتا ہے۔ وہ کاہل ہوتے ہیں اور کام میں حصہ نہیں لے پاتے۔ آج بھی اور پچھلی تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ مصیبتوں میں پلنے والے لوگوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں، انڈیا میں تقریباً تمام بڑے لیڈروں نے مشکل حالات میں پرورش پائی۔ اسی طرح جتنے بڑے بڑے دولت مند لوگ ہیں وہ سب غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے اور پھر محنت کرکے ترقی حاصل کی۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسے مفکر پیدا ہوتے رہے جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ آئیڈیل انسانی سماج بنائیں یا آئیڈیل ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ ہر ایک اپنی تمام کوششوں کے باوجود صرف ایک غیر معیاری سماج بنا سکا۔

تاریخ کا یہ ظاہرہ بھی خالق کے تخلیقی منصوبے کو سامنے رکھنے سے پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ خالق نے موجودہ دنیا اِس لیے نہیں بنائی کہ یہاں آئیڈیل سماج یا آئیڈیل ریاست قائم ہو۔ موجودہ دنیا کی محدودیت اور اس کے اندر مختلف قسم کے ڈس ایڈوانٹیج (disadvantage) کا ہونا حتمی طور پر اِس امر میں مانع ہے کہ یہاں کوئی آئیڈیل سماج یا آئیڈیل ریاست قائم ہوسکے۔



بھلاوہ کلچر

موجودہ زمانے میں جو ترقی یافتہ کلچر ساری دنیا میں رائج ہوا ہے اس کے مختلف نام دئے جاتے ہیں— ماڈرن کلچر، کنزیومر کلچر، مٹیریل کلچر، انٹرٹینمنٹ کلچر، سیکولر کلچر، ویسٹرن کلچرل وغیرہ۔ مگر زیادہ صحیح طور پر اس کا نام صرف ایک ہے اور وہ ہے بھلاوہ کلچر۔

اس کلچر نے موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ کیا ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر انسان کو بھلاوہ میں ڈال دیا ہے۔ آج کا انسان مختلف قسم کی نئی نئی چیزوں میں مشغول رہتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی میں وہ موقع ہی نہیں آتا کہ وہ حقیقتِ اعلیٰ کے بارے میں سوچ سکے۔

قدیم زمانے میں انسان کے پاس بہت سے ایسے لمحات ہوتے تھے جب کہ وہ مشغولیت سے خالی ہوتا تھا۔ ان خالی اوقات کو وہ معنویت کی تلاش میں گزارتا تھا۔ وہ اشیاء کی حقیقت پر غور کرتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ ظاہری دنیا کے پیچھے جو اعلیٰ حقیقت ہے اس کو سمجھ سکے۔ مگر موجودہ زمانے کی مصنوعی سرگرمیوں نے انسان کو اپنی طرف اتنا زیادہ کھینچ لیا ہے کہ کسی کے پاس بھی اب زیادہ بامعنی سوالات پر غور کرنے کا وقت نہیں۔

انسانی زندگی کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ مادی ضرورتوں کی تکمیل کس طرح کی جائے۔ پچھلے زمانے میں یہ سوال ایک سادہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ زندگی کی ضرورت کو فراہم کیا جاسکے۔ مگر جدید کلچر نے اس مسئلے کو بہت زیادہ بڑھایا۔ پہلے یہ سوال تھا کہ زندگی کے لیے سہولتیں کس طرح حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر یہ سوال توجہ کا اصل مرکز بن گیا کہ زندگی کے عیش (luxuries) کو کس طرح فراہم کیا جائے۔ مزید آگے بڑھ کر یہ سوال یہاں تک پہنچا کہ زندگی کو کس طرح زیادہ سے زیادہ پرلطف بنایا جائے۔ انسانی خواہشوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ پورا کیا جائے۔ یہاں پہنچ کر انسان نے اپنی پوری زندگی صرف راحت کے مادی سامانوں کی فراہمی میں لگا دی۔ اس کے پاس اس کا وقت ہی نہ رہا کہ وہ زندگی کو زیادہ بامعنیٰ بنانے کے لیے سوچے یا وہ

اس کے لیے کچھ کرے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کی بنا پر ہم نے موجودہ کلچر کو بھلاوہ کلچر کہا ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے زندگی کی ضرورت، اور دوسرا ہے زندگی کا مقصد۔ موجودہ زمانے کی ترقیوں کا ایک بُرا پہلو یہ ہے کہ اس نے ضرورت کے سامان بہت زیادہ بڑھا دیے اوران سامانوں کو بہت زیادہ خوش نما بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انسان کی ساری توجہ ضرورت کی چیزوں پر لگ گئی۔ ضرورت کی فہرست اتنی زیادہ لمبی ہوگئی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ضرورت کے سامانوں کا حصول ہی انسان کے لیے سب کچھ بن گیا۔ پچھلے زمانے میں ضرورت کی تکمیل چند سادہ چیزوں سے ہوجاتی تھی، مگر اب اس کی فہرست اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔

سامانِ ضرورت نے اب ایک مستقل مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے، جس کا نام کنزیومرازم ہے۔ اس کا سنگین انجام یہ ہوا ہے کہ اب کسی انسان کے پاس مقصدِ حیات کے سوال پر سوچنے کا وقت نہیں۔ اب اعلیٰ مقصد ایک نامانوس لفظ بن گیا ہے۔ اِس صورت حال کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کی جاسکتا ہے کہ جدید کنزیومرازم نے انسان کو حیوانی سطح پر جینے کے لیے مجبور کردیا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ سطح پر جینا، اب لوگوں کے لیے ایک غیر معروف لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس صورت حال کی بھاری قیمت انسان کو یہ دینی پڑی ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء (intellectual development) رُک گیا ہے۔ آج تقریباً تمام انسانوں کا یہ حال ہورہا ہے کہ ان سے اُن کے پروفیشنل موضوع پر بات کیجئے تو وہ اس میں خوب ماہر دکھائی دیں گے۔ لیکن اگر ان کے پروفیشنل موضوع کے علاوہ دوسرے انسانی موضوعات پر بات کیجئے تو ایسا محسوس ہوگا گویا کہ آپ ایک نادان انسان سے بات کررہے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے بظاہر وہ پُر رونق دکھائی دیں گے لیکن ذہنی معیار کے اعتبار سے وہ ایک بَونا انسان معلوم ہوں گے۔

موجودہ کنزیومر کلچر کو اگر حیوانی کلچر کا نام دیا جائے تو شاید وہ غلط نہ ہوگا۔ حیوانی کلچر کے اِس فروغ کا یہ سنگین نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ موجودہ زمانے کے عورت اور مرد ایک قسم کے ذہنی بونے پن (intellectual dwarfism) کا شکار ہوکر رہ گیے ہیں۔

آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ اس کو جسمانی غذا تو خوب مل رہی ہے، مگر دوسرے پہلو سے وہ ذہنی فاقہ (intellectual starvation) کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آج انسان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس کو ذہنی فاقے کے اِس بحران سے باہر نکالا جائے۔ اس کو شعوری اعتبار سے اِس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ گہرے حقائق پر سوچ سکے۔ وہ زیادہ بامعنیٰ موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنا سکے۔ وہ حیوان کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی سطح پر جینے لگے۔

انسان کی ذہنی تاریخ کے دو دَور ہیں۔ ایک، کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے، اور دوسرا، کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد۔ گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے انسان نے علم اور ادب کے میدان میں بہت زیادہ ترقیاں حاصل کی تھیں۔ اس زمانے میں بہترین علمی اور ادبی کتابیں وجود میں آئیں۔ مگر کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد یہ ہوا کہ علم وادب کی ترقی رُک گئی۔ بعد کے اِس دور میں مشکل ہی سے کسی ایسی کتاب کا نام لیا جاسکتا ہے جو علم وادب کے اعتبار سے اعلیٰ معیار پر تیار کی گئی ہو۔

اس فرق کا معاملہ خود سائنس تک پہنچا ہے۔ کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے نظری سائنس کو زبردست ترقی ہوئی تھی۔ سائنس کے شعبوں میں بڑے بڑے اہلِ دماغ پیدا ہوئے، مگر کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد نظری سائنس کی ترقی تقریباً رُک گئی۔ اب اہلِ سائنس زیادہ تر اُن موضوعات پر کام کررہے ہیں جو آج کل کی اصطلاح میں مارکیٹ ایبل (marketable) آئٹم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پچھلے دَور میں سائنس، علمی تحقیق کا نام تھی۔ مگر اب سائنس زیادہ تر ایک قسم کی اقتصادی سرگرمی (commercial activity) بن کر رہ گئی ہے۔

اِس صورتِ حال کا یہ بھیانک نتیجہ ہوا ہے کہ علمی اور ذہنی ترقی کا سفر تقریباً رُک گیا ہے۔ ہر طرف خوش نما انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقی انسان تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہیں ملتا۔ اِس صورتِ حال کو بدلنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ انسانی آبادی ایک نئے قسم کا جنگل بن کر رہ جائے گی، قدرتی جنگل اور تمدنی جنگل میں صرف یہ فرق ہوگا کہ قدرتی جنگ کے حیوان فطرت کے لباس میں چل

پھر رہے ہوں گے، اور تمدّن کے جنگل میں خوش پوش حیوان چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔

نظریۂ ارتقاء کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اور حیوان کا جسم بہت زیادہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے۔ جسمانی افعال دونوں کے اندر یکساں قسم کے پائے جاتے ہیں۔ غذائی ہضم کا نظام جو ایک کے اندر ہے وہی دوسرے کے اندر بھی ہے۔ گویا کہ حیوان چار پاؤں سے چلنے والا انسان ہے، اور انسان دو پیروں سے چلنے والا حیوان۔

مگر نفسیات کا مطالعہ ایک مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ساری کائنات میں ایک انتہائی استثنائی مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی اس استثنائی حیثیت کا سبب صرف ایک ہے اور وہ انسان کا دماغ ہے۔ انسان کا دماغ انسان کو نہ صرف حیوانات سے بلکہ کائنات کی تمام چیزوں سے ممتاز طور پر مختلف بنا دیتا ہے۔ انسان کا دماغ انسان کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ یہ دماغ انسان کو ایک ایسی ممتاز حیثیت دے دیتا ہے جو وسیع کائنات میں کسی بھی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔

کنزیومرازم کے کلچر نے انسان کے جسمانی حصے کو تو بہت کچھ دیا مگر اس کے ذہنی حصّے کو تقریباً معطّل کر دیا۔ حالاں کہ یہ ذہنی حصّہ ہی انسان کا اصل وجود ہے۔ یہ ذہنی حصہ ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ ذہنی حصے کے بغیر انسان صرف حیوان ہے۔

اس کمی کو کو دور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ آج احیاءِ انسانیت کی تحریک چلائی جائے۔ انسان کو دوبارہ اس کی فطرت کی طرف لوٹایا جائے۔ انسان کو دوبارہ انسان بنایا جائے۔ انسان کو اِس قابل بنایا جائے کہ وہ دوبارہ اپنے ذہنی امکانات کو بروئے کار لائے۔ وہ ذہنی ارتقاء کے راستے پر دوبارہ سرگرمِ سفر ہو جائے۔

یہ تضاد کیوں

شیلے (Percy Bysshe Shelley) ایک انگلش شاعر ہے۔ وہ ۱۷۹۲ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۲۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غم ناک نغمے ہیں:

Our Sweetest songs are those that are saddest songs.

یہ ایک عام تجربے کی بات ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ اس کو دردناک کہانیاں یا غم انگیز اشعار زیادہ پسند آتے ہیں۔ اکثر مقبول ناول وہ ہیں جو طربیہ نہیں ہیں بلکہ المیہ ہیں۔ اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ گیت کار زیادہ مقبول ہوتے ہیں جو پُر سوز لہجے میں گانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ پُرسوز اشعار یا پُرسوز کہانیاں انسان کے دل کے تاروں کو چھیڑنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر انسان عملاً محرومی یا عدم یافت کی نفسیات میں جیتا ہے۔ ایسی حالت میں خوشی کی بات اس کو غیر واقعی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں غم کی بات اس کو زیادہ مبنی بَر واقعہ نظر آتی ہیں۔

زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان ایک لذت پسند حیوان ہے:

Man is a pleasure-seeker animal.

نا قابلِ پیمائش حد تک وسیع کائنات کے اندر انسان ایک استثنائی مخلوق ہے۔ اِس عالم میں انسان ایک واحد مخلوق ہے جو احساس لذّت کی صفت رکھتا ہے۔ یہ انسان کی انوکھی صفت ہے کہ وہ مختلف قسم کی لذّتوں کا احساس رکھتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ وسیع کائنات میں بے شمار مخلوقات ہیں مگر لذت سے لطف اندوز ہونے کی صفت استثنائی طور پر صرف انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔

انسان کے لیے سوچنا بھی لذت ہے، دیکھنا بھی لذّت ہے، سننا بھی لذت ہے، بولنا بھی لذّت

ہے، کھانا اور پینا بھی لذت ہے، سونگھنا بھی لذت ہے اور چھونا بھی لذت ہے، حتی کہ ہری گھاس کا لان ہو اور اس پر آپ ننگے پاؤں چلیں تو اِس لمس میں بھی آپ کو بے پناہ لذت محسوس ہوگی۔

مگر یہاں ایک عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ انسان کے اندر لذت کا احساس تو انتہا درجے میں موجود ہے مگر لذت سے لطف اندوز ہونا اس دنیا میں اس کے لیے ممکن نہیں۔ میں ایک بار کشمیر گیا، وہاں پہل گام کے علاقے میں ایک پہاڑی دریا ہے جو پہاڑوں کے اوپر برف پگھلنے سے جاری ہونے والے چشموں کے ذریعہ سے بنتا ہے۔ اس کا پانی انتہائی خالص پانی ہے۔ جب میں پہل گام پہنچا اور وہاں دریا کے صاف وشفاف پانی کو دیکھا تو مجھے خواہش ہوئی کہ میں اس کا پانی پیوں۔ میں نے بہتے ہوئے دریا سے ایک گلاس پانی لے کر پیا تو وہ مجھے بہت زیادہ اچھا لگا، تمام مشروبات سے زیادہ اچھا۔ میں نے ایک گلاس کے بعد دوسرا گلاس پیا، یہاں تک کہ میں چھ گلاس پانی پی گیا۔

چھٹے گلاس کے بعد بھی میرا اشتیاق باقی تھا، مگر میں مزید پانی نہ پی سکا۔ اب میرے سر میں سخت درد شروع ہوگیا۔ درد اتنا شدید تھا کہ مجھے فوراً وہاں سے واپس ہونا پڑا۔ میں واپس ہوکر سری نگر پہنچا۔ سری نگر میں ایک کشمیری تاجر کے یہاں میرے شام کے کھانے کا انتظام تھا۔ کئی اور لوگ اِس موقع پر بلائے گیے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو میرے سر میں اتنا شدید درد ہورہا تھا کہ میں کھانے میں شریک نہ ہوسکا۔ بلکہ ایک اور کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔

یہی حال دنیا کی تمام لذتوں کا ہے۔ انسان دولت کماتا ہے۔ اقتدار حاصل کرتا ہے۔ اپنی پسند کی شادی کرتا ہے۔ اپنے لیے شان دار گھر بناتا ہے۔ عیش کے تمام سامان اکھٹا کرتا ہے۔ مگر جب وہ یہ سب کچھ کر چکا ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور لذتوں کے درمیان ایک حتمی رکاوٹ حائل ہے۔ کسی بھی لذت سے وہ اپنی خواہش کے مطابق لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ لذت کے تمام سامان بھی اس کو خوشی اور سکون دینے میں ناکام رہتے ہیں۔

لذتوں کے بارے میں انسان کی خواہش لامحدود ہے۔ مگر لذتوں کو استعمال کرنے کے لیے وہ خود ایک محدود صلاحیت رکھنے والا انسان ہے۔ انسان کی یہی محدودیت ہر جگہ اس کے اور سامانِ لذت

کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔سب کچھ پانے کے بعد بھی وہ بدستور احساسِ محرومی میں مبتلا رہتا ہے۔ انسان کی جسمانی کمزوری، جوانی کا زوال، بڑھاپا، بیماری، حادثات اور آخر میں موت، مسلسل طور پر اس کی خواہشوں کی نفی کرتے رہتے ہیں۔لذت کا سامان حاصل کر لینے کے باوجود یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو خواہش کی تکمیل سے پہلے ہی اس کی طاقت کی حد آجاتی ہے۔ وہ ایک ختم شدہ طاقت (spent force) کی مانند بن کر رہا جاتا ہے۔

اس تضاد کو لے کر مزید مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تضاد دراصل تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ترتیب کے فرق کا نتیجہ ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ فطرت کے نظام کے تحت، انسان کے لیے یہ مقدر کیا گیا ہے کہ وہ موت سے قبل کے دَور میں اپنی مطلوب لذتوں کا صرف تعارف حاصل کرے اور موت کے بعد کے دَور میں ان لذتوں کو حقیقی طور پر اور مکمل طور پر حاصل کرے۔

یہ ترتیب اتفاقی نہیں ہے، وہ خود فطرت کا حصہ ہے، وہ فطرت کے پورے نظام میں پائی جاتی ہے۔اِس دنیا میں انسان کو جو کامیابی بھی ملتی ہے وہ اسی ترتیب کے اصول کے تحت ملتی ہے۔اس دنیا کی کوئی بھی کامیابی ترتیب کے اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

زراعت میں پہلے بونا ہوتا ہے اس کے بعد کاٹنا۔ باغبانی میں پہلے پَودا اُگانا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا پھل حاصل کرنا۔لوہے کے ساتھ پہلے پگھلانا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کو اسٹیل بنانا۔ غرض اس دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہی ترتیب اور تدریج کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہر چیز پہلے اپنے ابتدائی دَور سے گذرتی ہے اور پھر وہ اپنے انتہائی مرحلے تک پہنچتی ہے۔فطرت کے اِس اصول میں کسی بھی چیز کا کوئی استثنا نہیں۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔انسان کو لذت کا لامحدود احساس دیا گیا ہے مگر لذتوں سے لامحدود طور پر تمتُّع کرنے کا سامان موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے۔موجودہ دنیا میں آدمی اپنی لذت طلبی کی صلاحیت کو دریافت کرتا ہے اور اگلی دنیا میں وہ اپنی لذت طلبی کے مطابق، لذت کے تمام سامانوں کو حاصل کرے گا۔موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں لذت کا احساس،

اور موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں لذت سے تمتع۔

خالقِ کائنات نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، ایسا کیا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ انسان کو ممکن لذتوں کا ابتدائی تعارف کراتا ہے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اگر تم اِن لذتوں سے ابدی طور پر اور کامل طور پر متمتّع ہونا چاہتے ہو تو اپنے اندر اس کا استحقاق پیدا کرو۔

یہ استحقاق کیا ہے۔ یہ استحقاق، ایک لفظ میں یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو پاکیزہ روح (purified soul) بنائے۔ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے منفی احساسات سے پاک کرے۔ وہ اپنے آپ کو لالچ، خودغرضی، حسد، بددیانتی، جھوٹ، غصّہ، انتقام، تشدّد اور نفرت جیسے تمام غیر انسانی جذبات کا شکار ہونے سے بچائے۔ وہ اپنے اندر وہ اعلیٰ انسانی شخصیت پیدا کرے جو مکمل طور پر مثبت شخصیت ہو۔ جو اپنے اعلیٰ اوصاف کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ وہ خدا کے پڑوس میں رہ سکے۔ جو شیطانی انسان سے اوپر اٹھ کر ملکوتی انسان (divine personality) بن جائے۔

انسان کی زندگی دو مرحلوں میں تقسیم ہے — موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ اس مرحلۂ حیات کا نسبتاً مختصر حصّہ موت سے پہلے کے دور میں رکھا گیا ہے۔ اور اس کا زیادہ طویل عرصہ موت کے بعد کے دَور میں۔ انسان کی کہانی کو اگر صرف موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات کی نسبت سے دیکھا جائے تو وہ ایک المیہ (tragedy) نظر آئے گی۔ لیکن اگر انسان کی کہانی کو موت کے بعد کے مرحلۂ حیات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو وہ مکمل طور پر ایک (comedy) نظر آنے لگے گی۔

فطرت کے اس تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، انسان ایک انتہائی نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام پر ہے جہاں اس کو دو ممکن انتخابات میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے — موجودہ دنیا کے مواقع کو فطرت کے نقشے کے مطابق استعمال کرنا اور پھر ابدی لذتوں میں جینے کا مستحق بن جانا۔ یا موجودہ دنیا میں غفلت کی زندگی گذارنا، اور بعد کے دورِ حیات میں ابدی طور پر لذتوں سے محروم ہو جانا۔

کائنات میں انسان کا مقام

انسان اور انسان کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے اس کو مصلحین (reformers) اور مفکرین نے درست طور پر دریافت کیا۔ یہ تعلق مختصر طور پر یہ تھا— ہر انسان آزاد ہے، اس وقت تک جب تک کہ ایک انسان کی آزادی دوسرے انسان کی آزادی میں خلل ڈالنے والی نہ ہو۔ اس نظریے کو ایک کہانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکا جب یورپ کے سیاسی قبضے سے آزاد ہوا، اس وقت ایک امریکی شہری اپنے گھر سے باہر نکلا۔ وہ اپنی آزادی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ وہ ایک سڑک پر اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا بے فکری کے ساتھ چل رہا تھا۔ اِس اثنا میں اس کا ایک ہاتھ دوسرے مسافر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ مسافر کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ تم نے کیوں اپنے ہاتھ سے میری ناک پر مارا۔ امریکی شہری نے جواب دیا کہ آج امریکا آزاد ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ میں جو چاہوں کروں۔ مسافر نے کہا کہ میرے بھائی، تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

My brother, your freedom ends where my nose begins.

یہ قصہ انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے اصول کو درست طور پر بیان کرتا ہے۔ مگر جہاں تک انسان اور خدا کے درمیان تعلق کی بات ہے اس کو انسان درست طور پر دریافت نہ کر سکا۔ اس طرح اس معاملے میں انسان کی دریافت صرف پچاس فیصد کے بقدر تھی۔

تاہم یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تعلق کا اصول ہی یہ بتا رہا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان درست تعلق کا اصول کیا ہے۔ مذکورہ اصول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس تعلق کا اصول مختصر طور پر یہ ہے— انسان کی آزادی اس حد پر ختم ہو جاتی ہے جہاں سے خدا کی حد شروع ہوتی ہے:

Man's freedom ends where God's domain begins.

اس دنیا میں انسان کو جو چیزیں ملی ہیں وہ سب کا سب خدا کا عطیہ ہیں۔تمام چیزیں خدا کے دینے سے انسان کو ملی ہیں۔ٹھیک یہی معاملہ آزادی کا بھی ہے۔اس دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہوئی ہے وہ مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر عطیہ اپنے ساتھ ذمّے داری بھی لاتا ہے۔اس عام اصول کے تحت، انسان کو ملی ہوئی آزادی بھی ایک لازمی ذمے داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ وہ ذمے داری یہ ہے کہ — انسان اپنی آزادی کا صرف صحیح استعمال کرے، وہ کبھی اس آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔

آزادی کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی اِس آزادی کو اپنا حق سمجھ لے۔ وہ یہ یقین کرلے کہ میں اس آزادی کا مالک ہوں۔ میں جس طرح چاہوں اِس آزادی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروں۔اپنی آزادی کو استعمال کرنے کے بارے میں مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے مقابلے میں آزادی کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کو جو آزادی حاصل ہے، وہ اس کو کسی کے دینے سے ملی ہے۔اور پھر یہ معلوم کرے کہ جو آزادی کا دینے والا ہے اس کی منشا اس آزادی سے کیا ہے، اور اس کی منشا کے مطابق، مجھے اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔یہی وہ دریافت ہے جو کسی آدمی کے لیے اپنی آزادی کو استعمال کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ آزادی کا صحیح استعمال اور غلط استعمال کوئی پُر اسرار چیز نہیں۔کوئی بھی شخص اگر سنجیدہ ہے تو وہ یقینی طور پر اس کو دریافت کرسکتا ہے۔کسی بھی حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔اس طرح آزادی کے اِس قانون کو دریافت کرنے کے لیے بھی سنجیدگی لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

جو آدمی اِس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ سب سے پہلے اس دریافت تک پہنچے گا کہ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر صحیح اور غلط کی ایک کسوٹی رکھی ہوئی ہے۔ ہر آدمی خود اپنے فطری شعور کے تحت یہ جان سکتا ہے کہ کون سا رویّہ صحیح ہے اور کون سا رویّہ غلط۔فطرت کی یہ کسوٹی وہی ہے جس

کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔ اِسی کا دوسرا نام کامن سنس (common sense) بھی ہے۔

اس طرح آدمی خود اپنی فطرت کی آواز کے تحت، یہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ہر آدمی کی فطرت گویا اس کے لیے ایک گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر ایک متنبّہ کرنے والا عنصر (warner) موجود ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ عنصر کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اپنی ڈیوٹی کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرتا۔

اس سلسلے میں پہلی بات جو فطرت کے اس نظام کے تحت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک طاقت ور جذبہ موجود ہے۔ یہ اعتراف (acknowledgement) کا جذبہ ہے۔ ہر عورت اور مرد ذاتی طور پر اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے ضمیر یا کامن سنس کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ جب بھی ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے تو دوسرے شخص کو چاہیے کہ وہ بھر پور طور پر اس کا اعتراف کرے۔ انسان کا داخلی گائڈ اعتراف کو ایک اعلیٰ اخلاقی قدر سمجھتا ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق، اعتراف مسلّمہ طور پر شرافت کا اعلیٰ وصف ہے۔ اور بے اعترافی پستی اور ذلت کی پہچان ہے۔ اعتراف کرنے والا اپنی حیثیتِ انسانی کو برقرار رہتا ہے، اور اعتراف نہ کرنے والا اپنے آپ کو انسانی درجے سے نیچے گرالیتا ہے۔

ضمیر یا کامن سنس کا یہ فیصلہ خالق کے معاملے میں بھی یکساں طور پر درست ہے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ خود اپنی فطرت کی آواز کے تحت اپنے خالق کا اعتراف کرے۔ وہ اپنے خالق کے احسانات کو مانے۔ اس کے خالق نے اس کو جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان کو اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ محسوس کرے اور زبان سے کھلے طور پر اس کا اعلان کرے۔ خالق کا اعتراف فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اور خالق کا عدمِ اعتراف فطرتِ انسانی سے انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ہر عورت اور مرد کا تجربہ ہے کہ اس کا ضمیر ایک اخلاقی کسوٹی ہے۔ جو ہر موقعے پر اس کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ضمیر جھوٹ بولنے پر اس کو ملامت کرتا ہے اور سچ بولنے پر اس کے لیے اطمینان کا باعث بنتا ہے۔ یہ ضمیر ناانصافی کو بُرا سمجھتا ہے، اور انصاف کو ہمیشہ اچھا بتاتا ہے۔ یہ ضمیر بددیانتی

(dishonesty) پر اپنی بے زاری ظاہر کرتا ہے اور دیانت داری پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ضمیر تشدد کو غیر انسانی چیز سمجھتا ہے اور امن کو ایک اعلیٰ انسانی اصول کا درجہ دیتا ہے۔ یہ ضمیر نفرت کو پست کرداری کی حیثیت دیتا ہے، اور محبت کو اعلیٰ انسانی قدر کا درجہ عطا کرتا ہے۔ یہ ضمیر غصّے کو رد کر دیتا ہے، اور معافی پر اپنی پسندیدگی کا سرٹفکٹ عطا کرتا ہے، وغیرہ۔

اسی طرح انسان جب اپنے باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اس کے علاوہ تمام مخلوقات سختی کے ساتھ اپنے خالق کے قانون میں بندھی ہوئی ہے۔ زمین سے لے کر وسیع خلا تک، ہر چیز انتہائی ڈسپلن کے ساتھ اپنے مُفوّضہ عمل کو انجام دیتی ہے۔ کوئی چیز، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اِس ڈسپلن سے انحراف نہیں کرتی۔ زمین کے جمادات، نباتات اور حیوانات سے لے کر خلا کے ستاروں اور سیّاروں تک ہر چیز مکمل طور پر اِس آفاقی ڈسپلن میں بندھی ہوئی ہے۔

یہ ڈسپلن خالق کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہی ڈسپلن انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بقیہ کائنات کی طرح اس کائناتی ڈسپلن کا حصہ بن جانا ہے، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی بقیہ چیزیں مجبورانہ طور پر اِس عالمی ڈسپلن میں بندھی ہوئی ہیں جب کہ انسان کو اختیارانہ طور پر اپنے آپ کو اس ڈسپلن میں شامل کر لینا ہے۔

مثلاً شمسی نظام کے تمام سیّارے (planets) سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ خالق کو اپنا مرکز ومحور بنا کر اس کے گرد اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ اِس دنیا کی کوئی بھی چیز ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ یہاں کی چیز مسلسل طور پر حرکت میں ہے۔ پوری کائنات ایک عظیم کارخانے کی مانند حرکت وعمل میں مصروف ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں نہ شور ہے اور نہ دھواں۔ یہاں کسی بھی قسم کی کوئی کثافت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بنائے کہ اس کی سرگرمیاں کسی بھی قسم کی کثافت (pollution) کا سبب نہ بنیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز نفع رسانی کے اصول پر قائم ہے۔ روشن سورج سے لے کر بہتے ہوئے دریا تک، اور سرسبز درختوں سے لے کر ہواؤں کے جھونکوں تک، اور پہاڑوں سے لے کر کیڑے مکوڑوں

تک، ہر چیز کوئی مفید عمل انجام دے رہی ہے۔ اس وسیع کائنات کا ہر جُز یک طرفہ طور پر دینے والا ہے نہ کہ لینے والا۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اس دنیا میں اپنی زندگی کا نقشہ اس طرح بنائے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن جائے۔ ہر انسان سے دوسرے انسان کو فائدہ پہنچ رہا ہو۔

اسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ہمیشہ انجام کو سوچ کر اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ انسان کی سوچ ایک نتیجہ رُخی (result-oriented) سوچ ہے۔ انسان اسی عمل کو پسند کرتا ہے جس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے۔ انسان کی فطرت اِس سے اِبا کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

اِس انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان وسیع تر معنوں میں اِس اصول کے مطابق اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ جس طرح وہ موت سے پہلے کے عرصۂ حیات میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی نتیجے کو سامنے رکھ کر کرتا ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد کے عرصۂ حیات کے لیے بھی نتیجے کو معیار بنائے۔ وہ قبل از موت اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو اس طرح منظّم کرے جو بعد از موت عرصۂ حیات میں اس کے لیے مفید ثابت ہونے والا ہو۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہماری دنیا کا نظام آج اور کل یا حال اور مستقبل میں بٹا ہوا ہے۔ مگر انسان کے سوا اِس دنیا میں جو مخلوقات ہیں وہ سب کی سب آج میں عمل کرتی ہیں۔ آج یا حال کے سوا ان کے اندر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ کل (tomorrow) کا لفظ صرف انسان کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔ دوسری مخلوقات کی ڈکشنری کل کے لفظ سے خالی ہے۔

یہ فرق گویا فطرت کا ایک اشارہ ہے۔ اس فرق کی صورت میں فطرت انسان کو بتا رہی ہے کہ تم صرف آج (today) پر قناعت نہ کرو بلکہ تمھیں کل (tomorrow) کو سامنے رکھ کر اپنی سرگرمیوں کا نقشہ بنانا ہے۔ دوسری مخلوقات کی کامیابی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آج کو پالیں۔ مگر انسان کی کامیابی یہ ہے وہ آج کے بعد اپنے کل میں بھی کامیاب رہے۔ وہ موت کے بعد آنے والی ابدی دنیا میں اپنے لیے بہتر مقام حاصل کرلے۔

جنت کا استحقاق

جنت بے حد عظیم نعمت ہے۔ وہ بے حد مہنگی قیمت پر کسی کو ملے گی۔ بہت تھوڑے خوش نصیب لوگ ہوں گے جو جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھہریں۔

جنت میں داخلے کا پہلا امتحان یہ ہے کہ آدمی معرفت کے درجے میں اپنے رب کو پائے۔ افکار وخیالات کے جنگل میں وہ سچائی کو دریافت کرے۔ وہ نہ دکھائی دینے والے واقعے کو دیکھے۔ وہ نہ محسوس ہونے والی چیز کو محسوس کرے۔ وہ ظاہری ہنگاموں سے گزر کر باطن کی دنیا کا مسافر بن جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ آدمی سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے۔ خود پرست بننے کے تمام محرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سچا خدا پرست بن جائے۔ کشش اور جاذبیت کے بے شمار مراکز سے منہ موڑ کر وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ صرف اس شخص کے لیے ممکن ہوگا جو منفی حالات کے درمیان ہمیشہ مثبت ذہن پر قائم رہے۔ جو اپنے سینے میں اٹھنے والے حسد اور گھمنڈ اور انتقام جیسے جذبات کو دفن کر کے یک طرفہ طور پر لوگوں کے لئے شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جائے۔ جو ظلم اور بے انصافی کے مواقع کو پانے کے باوجود انہیں استعمال نہ کرے اور ہر حال میں اپنے آپ کو عدل وانصاف کا پابند بنالے۔

جنت ایک نفیس ترین خدائی کالونی ہے۔ اس نفیس کالونی میں صرف وہی روحیں داخل ہوں گی جو آخرت میں اس طرح پہنچیں کہ دنیا میں انھوں نے اپنے اوپر تطہیر کا عمل کرلیا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کثیف شخصیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اب ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی ذات پر خود تطہیری کا ایک مسلسل عمل شروع کرے۔ یہاں تک کہ اس کی کثیف شخصیت پاک وصاف ہو کر لطیف شخصیت میں بدل جائے۔

جنتی انسان وہ انسان ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہے۔ جو اندھیروں کے درمیان

روشنی کا مینار بن سکے۔ جو زلزلوں اور طوفانوں کے درمیان سکون کا راز پالے۔ جو نفرتوں کے درمیان محبت کا ثبوت دے۔ جو لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر انھیں معاف کردے۔ جو کھونے میں بھی پانے کا تجربہ کرے۔

جنتی انسان وہ ہے جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی خدا سے قریب ہوگیا ہو۔ جو سورج کی شعاعوں میں خدا کے نور کو دیکھے۔ جو ہواؤں کے جھونکے میں لمسِ ربانی کا تجربہ کرے۔ جو پہاڑوں کی بلندی میں خدا کی عظمت کا تعارف حاصل کرسکے۔ جو دریاؤں کی روانی میں خدا کی رحمت کا مشاہدہ کرے۔ جو مخلوقات کے آئینے میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے یہ بتا دیا ہے کہ جنتی انسان کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے اندر جنتی صفات پیدا کریں، وہ موت کے بعد جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

جنت میں داخلہ نہ کسی سفارش کی بنیاد پر ہوگا، نہ کسی کے ساتھ نسبت کی بنیاد پر اور نہ کسی پراسرار عملیات کی بنیاد پر۔ جنت میں داخلہ پوری طرح معلوم حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنے قول وعمل کے اعتبار سے جنتی انسان بن کر رہے گا، وہ آخرت کی جنت میں داخلہ پائے گا۔

قرآن کے مطابق، جنت اہل تزکیہ کے لئے ہے (طٰہٰ: 76)۔ تزکیہ یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کردے۔ نفس کی خواہش ابھرے تو وہ اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو وہ اس کو اپنے اندر دفن کردے۔

حج کا سانحہ

اِس سال حج کی ادائیگی کے موقعے پر ۱۲ جنوری ۲۰۰۶ء کو ایک دردناک حادثہ پیش آیا۔ رپورٹ کے مطابق، اِس سال تقریباً ۲۶ لاکھ مسلمان حج کی ادائیگی کے لیے مکہ پہنچے تھے۔ یہ لوگ ساٹھ ملکوں سے آئے تھے۔ اتنے بڑے مجمع میں اگر لوگ باشعور نہ ہوں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیش آئے گی۔ چنانچہ جَمرات پر کنکری پھینکنے کی سنّت ادا کرنے کے لیے لوگ بڑی تعداد میں وہاں جمع ہوگیے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ ہجوم کر کے جمرات کی طرف آگے بڑھے۔ اِس اثنا میں ایک معمولی واقعے پر مجمع میں بھگدڑ مچ گئی، جس کے نتیجے میں 362 آدمی دب کر مر گیے اور ایک ہزار سے زائد عورت اور مرد زخمی ہو گیے۔

حج کے موقع پر اس طرح کا حادثہ تقریباً ہر سال پیش آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا اصل سبب دریافت کیا جائے۔ اصل سبب کو دریافت کیے بغیر اس صورتِ حال کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

میرا خیال ہے کہ اس طرح کے حادثات کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگ حج کو مخصوص مراسم (rituals) کی ادائیگی کا ایک معاملہ سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حج کے کچھ ظاہری مراسم ہیں، اور ان کی ادائیگی ضروری ہے، لیکن اصل اہمیت روح (spirit) کی ہے، مراسم کی حیثیت اضافی ہے، اور روح کی حیثیت حقیقی۔ اسی ذہن کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جب جمرات کے مقام پر پہنچتے ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ جمرات پر کنکریاں پھینکنے کا معاملہ رسمی رمی (symbolic stoning) کا معاملہ ہے، نہ کہ سچ مچ ہی شیطان کو پتھر مارنے کا معاملہ۔

جیسا کہ معلوم ہے، منیٰ کے مقام پَر جن جَمرات پر کنکری ماری جاتی ہے، وہ خود شیطان نہیں ہوتا، بلکہ وہ پتھر کی صورت میں شیطان کی صرف ایک مادّی علامت ہوتی ہے۔ جب حاجی کنکری پھینکتا ہے تو اس کی کنکری خود شیطان کو نہیں مارتی بلکہ وہ اس کے علامتی پتھر پر جا کر گرتی ہے۔ لیکن جذبات کے وفور میں لوگ اِس فرق کو بھول جاتے ہیں، اور رمی کے وقت اِس طرح جوش میں آجاتے ہیں جیسے کہ وہ خود شیطان پر سنگ باری کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا کہ شیطان مجسّم ہو کر ایک زندہ وجود کی صورت میں وہاں موجود ہوتا تو شیطان کو مارنے کے لیے یہ ضروری ہوتا کہ حاجی کی ہر کنکری شیطان کے جسمانی وجود پر جا کر گرے۔ لیکن علامتی طور پر مارنے کی بنا پر اس کی حیثیت بدل جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیطان کو کنکری مارنا، مکمل طور پر ایک علامتی فعل ہے، نہ کہ حقیقی فعل۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی مسئلے کے مطابق، حاجی کی کنکری کا جَمرہ پر گرنا ضروری نہیں۔ اِسی طرح حاجی اگر کمزور ہے اور مجمع میں گھس کر جَمرہ کے قریب پہنچنا اس کے لیے مشکل ہے تو وہ نیابۃً بھی کنکری مار سکتا ہے۔ یعنی وہ اپنی کنکری کسی دوسرے شخص کو دے دے اور وہ اس کی طرف سے اس کو جمرہ کی طرف پھینک دے۔

اگر لوگ شعوری طور پر اس بات کو جانیں کہ وہ زندہ شیطان کو کنکری نہیں مار رہے ہیں بلکہ وہ شیطان کے علامتی پتھر پر، صرف علامتی طور پر کنکری پھینک رہے ہیں تو رمی کے واقعے میں جذبات کا وفور شامل نہ ہوگا، بلکہ رمی کا واقعہ ایک سادہ واقعہ بن جائے گا۔ رمی کے موقع پر حاجیوں کے اندر جوش کا پیدا ہونا، صرف اس لیے ہوتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خود شیطان کو پتھر مار رہے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں یہ بات موجود ہو کہ یہ صرف علامتی رمی (symbolic stoning) ہے تو یہ معاملہ جذباتی جوش وخروش کا معاملہ نہ بنے بلکہ صرف ایک سادہ کارروائی کے طور پر اس کی ادائیگی ہو جائے۔

ہر سال حج سے پہلے حج کی تعلیم وتربیت کے نام پر لوگوں کو حج کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ اور مختلف قسم کی دعاؤں کے الفاظ یاد کرائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ حاجیوں کی وطن سے روانگی کے وقت سے لے کر مکّہ پہنچنے تک، حتی کہ خود جہاز کے اندر جاری رہتا ہے۔ مگر یہ تمام تعلیم وتربیت حج کے ظاہری مراسم کو بتانے کے لیے ہوتی ہے۔ میرے علم کے مطابق، کوئی ایسا نہیں کرتا کہ وہ حج کی اصل اسپرٹ کو بتائے۔ اس کے نتیجے میں ہر حاجی کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ حج کی بجا آوری کچھ بے روح مراسم کی صحتِ ادائیگی کا نام ہے، اسپرٹ یا شعور کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے تجربے کے مطابق، اِسی مخصوص مزاج نے سارے مسائل پیدا کیے ہیں۔

ایسے موقع پر اکثر لوگ سعودی حکومت کو ذمے دار ٹھہرا کر انتظامی اصلاح کی تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ اِس قسم کی تجویزیں بے فائدہ ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ حاجیوں کی ذہن سازی کی جائے۔ ان کی شعوری تربیت کی جائے۔ مثال کے طور پر رمیِ جمرات کے سلسلے میں انھیں بتایا جائے کہ تم خود شیطان پر ضرب نہیں لگا رہے ہو بلکہ علامتی طور پر خود اپنے اندر یہ زندہ ارادہ پیدا کر رہے ہو کہ تم شیطان کے وسوسوں کا اثر نہیں لوگے بلکہ شیطان کو اپنے سے دور بھگا کر خدا کے احکام کی پَیروی کروگے۔ یہی اِس مسئلے کا حقیقی حل ہے۔

(۱۷ جنوری ۲۰۰۶)

کارٹون کا مسئلہ

شمالی یورپ کا ایک علاقہ ہے جس کو اسکینڈی نیویا کہتے ہیں۔ اِس علاقے میں چار ممالک واقع ہیں— سویڈن، ناروے، فِن لینڈ اور ڈنمارک (Denmark)۔ یہاں کی آبادی میں تقریباً 2 لاکھ مسلمان ہیں۔ اسکینڈی نیویا یورپ کا ایک پُر امن خطّہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مگر پچھلے چند مہینوں سے وہ بَرعکس انداز میں، میڈیا میں نمایاں ہو رہا ہے۔

ڈنمارک میں ڈینش (Danish) زبان لکھی اور بولی جاتی ہے۔ ایک ڈینش اخبار شیلاندس پوستین (Jyllands Posten) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶ میں ایک کارٹون چھپا۔ کارٹون، جدید صحافت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کارٹون کا مقصد نہ تعریف ہے اور نہ توہین۔ کارٹون دراصل صحافت کا ایک تفنّن آمیز جُز (Comic item) ہے۔ چنانچہ عام طور پر لوگ کارٹون کو دیکھ کر یا تو اس سے محظوظ ہوتے ہیں یا سادہ طور پر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تاہم ڈنمارک کے اخبار کا مذکورہ کارٹون مسلمانوں کے لیے سخت قابلِ اعتراض ثابت ہوا۔ قصہ یہ تھا کہ اِس اخبار میں ایک مضمون کے تحت کچھ کارٹون شامل کیے گیے۔ اِن میں پیغمبر اسلام ﷺ کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ مثلاً ایک کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھری لیے ہوئے ہیں اور آپ کے سر پر ایک پگڑی ہے جس کے اوپر بم رکھا ہوا ہے۔

اِس کارٹون کی خبر جب عام ہوئی تو ہر جگہ کے مسلمان اُس کو دیکھ کر یا اس کو سُن کر مشتعل ہوگیے۔ ان کے نزدیک یہ کارٹون پیغمبر اسلام کی توہین کے ہم معنٰی تھا۔ جو کہ مسلمانوں کے لیے نا قابلِ برداشت حد تک قابلِ اعتراض ہے۔

چنانچہ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ بڑے بڑے جلوس نکالے گیے۔ ڈنمارک کے سفارت خانوں میں آتش زنی اور توڑ پھوڑ ہوئی۔ اِن پُر شور مظاہروں میں کئی افراد مارے گیے اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں یہ مظاہرے اتنے

بڑھے کہ حکومتوں کے لیے ان پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ اِس کے نتیجے میں جو ناخوش گوار واقعات پیش آئے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ کئی عرب ممالک نے ڈنمارک سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لیے اوراس سے اپنی تجارت منقطع کردی۔

ڈنمارک، ڈیری صنعتوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کی ڈیری صنعت کا تقریباً ۲۵ فیصد سامان عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک میں جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈنمارک کی کئی فیکٹریاں بند ہوگئیں اور بھاری تجارتی نقصان کی صورت میں ڈنمارک کواس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے نتیجے میں ڈنمارک کو روزانہ ایک ملین ڈالر کا نقصان ہونے لگا۔

اِس معاملے میں ڈنمارک اور دوسرے مغربی ملکوں کا موقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مطابق، آزادیٔ اظہار انسان کا ناقابلِ تنسیخ حق ہے، اور مذکورہ کارٹون اِسی حق کا ایک استعمال تھا۔ اِس لیے ڈنمارک کے اخبار میں مذکورہ کارٹون کی اشاعت ان کے نزدیک کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، مسلم جذبات کے لیے وہ ایک قابلِ اعتراض چیز ہوسکتی ہے لیکن ڈنمارک کے لوگوں کے نزدیک وہ صرف اپنی آزادی کا ایک استعمال تھا، اور مُلکی قانون کے مطابق، وہ آزادی کے اِس استعمال کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اجتماعی معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، یہ کہ آئیڈیل کیا ہے، اور دوسرے یہ کہ پریکٹکل طور پر کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔ اِس معاملے میں اہلِ ڈنمارک کا جواب آئیڈیل کے اعتبار سے بظاہر درست ہوسکتا ہے، لیکن پریکٹکل کے اعتبار سے دیکھیے تو وہ بالکل نادرست قرار پائے گا۔ آزادی کا استعمال ایک فرد اپنے کمرے میں کرے تو اُس سے کوئی اجتماعی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب وہ اپنی آزادی کا استعمال اجتماعی زندگی میں کرے تو یقینی طور پر مسائل پیدا ہوں گے۔ ایسی حالت میں فرد کو یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا وہ اُن منفی نتائج کا تحمل کرسکتا ہے جو آزادی کے لامحدود استعمال کی صورت میں اس کے لیے پیدا ہوں گے۔

استعمالِ آزادی کے اِسی پہلو کو لے کر امریکا کے پروفیسر اسکنر (Skinner) نے کہا تھا کہ

لامحدود آزادی کا تصور نہایت خطرناک ہے، ہم ایسی آزادی کا تحمّل نہیں کرسکتے:

We can't afford freedom.

ڈنمارک کے لوگ روایتی طور پر امن پسند لوگ ہیں، وہ مادّی خوش حالی میں یقین رکھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ڈنمارک کے لوگ یہ نادانی کریں گے کہ وہ اِس حد تک نظریہ پرست بن جائیں گے کہ وہ اپنی آزادی کا لامحدود استعمال کرتے رہیں، خواہ اس کے نتیجے میں ان کے بین اقوامی تعلقات خراب ہوں، ان کی فیکٹریاں بند ہوجائیں۔ ان کو ناقابلِ تلافی حد تک تجارتی نقصان کا سامنا کرنا پڑے۔ یقیناً اب وہ اِس معاملے میں اپنی پالیسی کو بدلیں گے۔ مگر فارسی شاعر کے مطابق، آدمی ایسا کام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو: کُجا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اِس معاملے میں مسلمانوں کو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق، احتسابِ خویش (introspection) سے کام لینا چاہیے۔ مسلمانوں کو بھی اِس معاملے میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ اِس طرح کے معاملے میں صحیح ردّعمل کیا ہے اور نتیجہ خیز (result oriented) تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔

اسلامی طرزِ فکر کے مطابق، سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو صرف ''سازش'' کی اصطلاح میں نہ سوچا جائے بلکہ زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ کارٹونسٹ نے جس تصور کو اپنے خاکے میں پیش کیا وہ تصور اس کو کہاں سے ملا۔ اگر غیر جذباتی انداز میں سوچا جائے تو خود مسلمان بھی اس میں یکساں طور پر شریک نظر آئیں گے۔

مثلاً کارٹونسٹ نے اپنے کارٹون میں دکھایا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھُری لیے ہوئے ہیں۔ بے لاگ انداز میں غور کیجئے تو کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو یہ تصوّر مسلم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملا۔ اقبال نے خود اپنے ایک شعر میں پیغمبر اسلام کے ماننے والوں کی تصویر اِن الفاظ میں پیش کی ہے: ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا۔ اقبال کے اِس مصرعے کا انگریزی ترجمہ مسٹر خوشونت سنگھ نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

To every vein of falsehood, every muslim was a knife.

اسی طرح ڈنمارک کا کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو ماننے والے خود یہ کررہے ہیں کہ اپنے جسم پر بم باندھ کروہ اجتماعی مقامات پر جاتے ہیں اور دھماکہ کرکے وہاں بہت سے لوگوں کو ہلاک کردیتے ہیں۔ میں نے اپنے کارٹون میں صرف یہ کیا تھا کہ بم کو جسم پر باندھنے کے بجائے اس کو سر کے اوپر رکھ دیا— ظاہر ہے کہ اس بات کا مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا جواب نہ ہوگا جو مذکورہ کارٹونسٹ کو مطمئن کرسکے۔

اسلام کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ مسلمان ایسا کوئی کام نہ کریں جو دوسروں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ ہم تو وہی کررہے ہیں جس کا نمونہ ہم کو تمہاری اپنی زندگی میں ملا تھا (ایں گنا ہے ست کہ در شہر شما نیز کنند)۔ مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی پرتشدد تصویر نہ بنائے تو خود ان کو بھی اپنے آپ کو پرتشدد اعمال سے بچانا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمان ایک پرتشدد عمل کریں اور میڈیا میں جب اس کی خبر آئے تو اس کے عنوان میں تشدد کے بجائے امن لکھا ہوا ہو۔

اسی طرح اسلام اور عقل دونوں کے اعتبار سے وہی عمل صحیح عمل ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے مثبت نتیجے کا حامل ہو۔ ایسا اقدام جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counterproductive) ثابت ہو، وہ نہ اسلام کے اعتبار سے درست ہے اور نہ عقل کے اعتبار سے۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھئے تو اقدام کا نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا ہے یعنی اسلام لوگوں کی نظر میں ایک ایسا مذہب بن گیا ہے جو آزادی کے خلاف ہے اور اپنے پیرووں کو تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اسلام کی صحیح تصویر نہیں۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن اُبَی تھا۔ وہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہلِ بیتِ رسول کے خلاف سخت سازشوں کی بنا پر اس قابل ہو چکا تھا کہ اس کو قتل کردیا جائے مگر پیغمبر اسلام نے قصداً اس کو قتل نہیں کیا اور فرمایا کہ موجودہ حالات میں اس کا قتل اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اس اصول کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ کیوں کہ پہلے بدنامی کی خبر صرف زبانی طور پر پھیل سکتی تھی مگر آج ایسی خبر پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے دور میں بجلی کی رفتار سے پھیلتی ہے۔

اس معاملے میں احتجاجات کا نتیجہ عملاً صرف معکوس صورت میں برآمد ہوا ہے اس کی ایک مثال

یہ ہے کہ 30 ستمبر 2005 کو جب یہ کارٹون ڈنمارک کے اخبار میں چھپا تو بہت تھوڑے لوگوں نے اس کو دیکھا تھا۔ مگر اس کے خلاف مسلمانوں کے پرشور احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کارٹون انٹرنٹ پر آ گیا۔ اور ساری دنیا میں کروڑوں لوگ اس توہین آمیز کارٹون کو انٹرنٹ پر دیکھنے لگے۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض (avoidance) کہا جاتا ہے۔ اعراض کا مطلب کسی ناپسندیدہ صورت حال میں ہَجرِ جمیل کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یعنی اعلیٰ ظرفی کا وہی طریقہ جس کو تمثیل کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے

اس معاملے میں پیغمبر اسلام کی زندگی میں ایک انوکھا نمونہ پایا جاتا ہے۔ ابن اسحاق نے ایک روایت میں بتایا ہے کہ قدیم مکہ میں عرب کے مخالفین، پیغمبر اسلام کو مــــذمَّـــم یعنی مذمت کیا ہوا (Condemned Person) کہتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے سامنے آ کر آپ کو مذمم کہتا تو آپ اس کا کوئی جواب نہ دیتے بلکہ سادہ طور پر یہ فرماتے کہ ان لوگوں کو دیکھو، یہ مجھ کو مذمم بتا کر مجھ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ میرا نام تو محمد (قابلِ تعریف) ہے۔ یعنی ان کی بری باتیں اس شخص پر پڑیں گی جس کا نام مذمم ہو۔ وہ مجھ پر پڑنے والی نہیں۔ کیوں کہ میرا نام تو محمد ہے، مذمّم نہیں۔

موجودہ زمانے کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اگر آدمی امن کے دائرے میں رہے تو وہ اپنے کسی بھی نظریے کو بلا روک ٹوک پیش کر سکتا ہے۔ البتہ تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہی اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی ہر تحریک پر امن دائرے میں رہ کر چلائیں تا کہ کوئی شخص ان کے خلاف بولنے کا موقع نہ پا سکے، خواہ کارٹون کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ سختی کے ساتھ اپنی جدوجہد کو پر امن طریق کار کا پابند رہتے ہوئے چلائیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھیں۔ وہ اپنی تحریکوں کو اس بین اقوامی اصول کے مطابق چلائیں۔ اس کے بعد ان کی تحریک زیادہ مؤثر ہو گی اور مزید یہ کہ اسلام اور مسلمان دونوں بدنام ہونے سے بھی بچ جائیں گے۔ (۱۷ فروری ۲۰۰۶)

اعراض کی ضرورت

جس طرح تصویر جدید صحافت کا ایک حصہ ہے، اسی طرح کارٹون بھی جدید صحافت کا ایک حصہ ہے۔ تصویر اور کارٹون دونوں کا مقصد ایک ہے — صحافت کو قارئین کے لیے دلچسپ بنانا۔ کارٹون کا مقصد نہ کسی کی تعریف ہوتی ہے اور نہ کسی کی توہین۔ وہ اخبار کا صرف ایک تفنّن آمیز جُز (comic item) ہوتا ہے۔ سنجیدہ آدمی کارٹون کو دیکھ کر یا اس سے محظوظ ہوگا یا وہ سادہ طور پر اس کو نظر انداز کردے گا۔

ڈنمارک کے ایک اخبار شیلا ندس پوستین (Jyllands Posten) ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ میں ایک مضمون کے تحت، ایک کارٹون چھپا۔ اس کارٹون میں پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاکہ بنایا گیا تھا، اور آپ کے سر پر ایک پگڑی دکھائی گئی تھی جس کی بناوٹ بم کی مانند تھی۔ اس کارٹون کی خبر جب مسلم دنیا تک پہنچی تو تمام مسلمان اس پر برہم ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے توڑ پھوڑ شروع کردی۔ کچھ لوگوں نے تقریر اور تحریر میں اس کے خلاف احتجاج کیا۔ میرے علم کے مطابق، ساری مسلم دنیا میں غالباً کوئی شخص نہیں تھا جو مسلمانوں کے اِس منفی ردّعمل کی کُھلی مذمت کرے۔ قابلِ اعتراض کارٹون کی مذمت کرنا اور منفی احتجاج کی مذمت نہ کرنا بلاشبہہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

کارٹون کے خلاف اِس منفی ردّعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا گیا کہ وہ پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم کے تحت کیا گیا ہے اور اِس قسم کی مہم ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر یہ سوچ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، اِس طرح کے معاملے میں صحیح سوچ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کا اصل سبب کیا ہے، اور اصل سبب کی نسبت سے اپنے ردّعمل کا تعیّن کیا جائے۔ غور کیجئے تو اِس قسم کے کارٹون کو وجود میں لانے کے ذمّے دار خود مسلمان ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے اندر ذاتی احتساب (introspection) کا ذہن اُبھرنا چاہیے نہ کہ دوسرے کے خلاف احتجاج ظاہر کرنے کا ذہن۔

عربی مثل ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس اصول کو اِس معاملے میں استعمال کر کے دیکھیے۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب ہیں۔ ہر مذہب کے مقدس پیشوا ہیں۔ مگر اِن پیشواؤں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے سر پر بم رکھا ہوا دکھایا جائے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ اس قسم کا معاملہ پیش آیا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان لمبے عرصے سے اسلام کے نام پر جگہ جگہ تشدد کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی تشدد میں ملوّث ہیں۔ مثلاً آئر لینڈ میں عیسائی، آسام میں ہندو، سری لنکا میں بدھسٹ وغیرہ۔ مگر فرق یہ ہے کہ دوسرے مذہب کے لوگ اپنا متشددانہ عمل اپنے قومی مفاد کے نام پر کرتے ہیں، جب کہ مسلمان اپنے متشددانہ عمل کو اسلامی جہاد کے نام پر کرتے ہیں۔

ایسی حالت میں یہ ایک فطری بات ہے کہ دوسری قوموں کا متشددانہ عمل ان کی اپنی قوم کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور مسلمانوں کا متشددانہ عمل ان کے مذہب کی طرف منسوب ہو اور مذہبِ اسلام کی بدنامی کا سبب بنے۔ اس اعتبار سے غور کیجئے تو مذکورہ اخباری کارٹون کو دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے اندر ذاتی احتساب کا جذبہ اُبھرنا چاہیے تھا۔ وہ کہتے کہ ہم نے خود اپنی روش کے ذریعے دنیا کو یہ تاثر دیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مذہب، تشدد کا مذہب ہے۔ اس لیے ہم کو چاہئے کہ ہم اسلام کے نام پر کیے جانے والے تشدد کو مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ یا اگر تشدد کرنا ہے تو اس کو اسلام کے نام پر نہ کریں، جیسا کہ دوسرے مذاہب کو ماننے والے کر رہے ہیں۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں صبر اور اعراض کے الفاظ آئے ہیں۔ صبر اور اعراض، تشدد کے برعکس رویّے کا نام ہے۔ تشدد یہ ہے کہ کوئی بات جو آپ کو ناگوار معلوم ہو اس پر مشتعل ہو جانا، اور احتجاج یا تخریب کاری کی صورت میں اپنے انتقامی جذبے کا اظہار کرنا۔ اس کے برعکس، صبر و اعراض یہ ہے کہ ناخوش گوار باتوں کا سامنا تحمل کے ساتھ کیا جائے۔ اپنے آپ کو منفی کارروائیوں سے بچایا جائے تا کہ اپنے مقصد کی طرف مثبت سفر کو جاری رکھا جا سکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں فطری طور پر ایسا ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنی آزادی کا

غلط استعمال کریں گے۔ جس سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن یہ صورت حال کسی فرد یا قوم کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کا نتیجہ ہے۔ خدا نے لوگوں کو جب امتحان کے لیے آزادی دی ہے تو ضرور ایسا ہوگا کہ لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں۔ خدا جب تک لوگوں کی آزادی کو منسوخ نہ کرے اس کا غلط استعمال بھی بہر حال جاری رہے گا۔

ایسی حالت میں ناخوش گوار واقعات پر مشتعل ہونا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی خدا کے تخلیقی نقشے پر راضی نہیں۔ خدا کی قائم کردہ دنیا اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک اور دنیا ہو جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ انسان اپنی پسند کی ایک اور دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کو مان کر اس کے تحت، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جس طرح دوسری باتوں کے نمونے موجود ہیں، اسی طرح مذکورہ صورت حال میں بھی آپ کی زندگی میں ہمارے لیے نمونہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق، قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مُذمَّم (قابلِ مذمّت) رکھا تھا۔ پھر وہ آپ پر سبّ وشتم کرتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے کہ کیا تم کو اِس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچالیا۔ وہ مجھ کو مذمم کہہ کر میرا سب وشتم کرتے ہیں اور میری ہجو کرتے ہیں، حالاں کہ میں محمد (قابل تعریف) ہوں۔ (سیرتِ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۳۷۹)

یعنی اُن کی باتیں میرے اوپر پڑنے والی نہیں۔ یہ لوگ مذمم پر سب وشتم کر رہے ہیں جب کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمّم۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس نمونے کی روشنی میں یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان جب مذکورہ کارٹون کو دیکھیں تو وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیں کہ پیغمبر اسلام تو بم بردار نہیں تھے بلکہ وہ امن بردار تھے۔ اس لیے یہ کارٹون پیغمبر اسلام سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی اور انسان سے متعلق مانا جائے گا جو بم بردار ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں دیکھنے کی اصل بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح کیا ہے اور غلط کیا بلکہ دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم نے اقدام کیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے، جب سے پریس کا زمانہ آیا ہے اِس طرح کے معاملات بار بار پیش آتے ہیں۔ ہر بار مسلمان اس پر سخت برہمی کا ظہار کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ توڑ پھوڑ اور تشدد کا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ نتیجہ ہمیشہ برعکس صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی اخباروں یا کتابوں میں مسلم نقطۂ نظر سے ناخوش گوار باتوں کا چھپنا تو بند نہیں ہوتا، البتہ اسلام شدید طور پر بدنام ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی فضا بگڑ جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان وہ معتدل ماحول باقی نہیں رہتا جو کسی مثبت کام کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر دعوتی کام کے اعتبار سے دیکھئے تو اس طرح کا منفی ردّعمل، قاتلِ دعوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اخباروں اور کتابوں میں برابر ایسی چیزیں چھپتی رہتی ہیں جو اسلام کی تصویر کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں۔ اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ اس کے خلاف مظاہرے کیے جائیں بلکہ اس کا صحیح اور مؤثر جواب یہ ہے کہ ایسی کتابیں تیار کر کے چھاپی جائیں جو ہر اعتبار سے نہایت اعلیٰ معیار کی ہوں۔ ان میں ایسے دلائل کے ذریعے اسلام کی مثبت تصویر کو پیش کیا جائے جو لوگوں کے ذہنوں کو مطمئن کرنے والے ہوں، اور لوگوں کے دلوں میں اُتر جائیں۔

موجودہ صورتِ حال میں اسلام کی نسبت سے، سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جس کو امیج بلڈنگ (image building) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرنا اور اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لانا۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے، اور کرنے والوں کو یہی کام کرنا چاہیے — **لمثل هٰذا فلیعمل العاملون۔**

تعلیم سب کچھ ہے

مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۱۴ میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کی کتاب مسدّس حالی ایک مشہور کتاب ہے۔ اپنی اِس کتاب میں جدید دور میں تعلیم کی اہمیت کو بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

بس اب وقت کا حکمِ ناطق یہی ہے　　　کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

یہ بات آج پہلے سے بھی زیادہ درست قرار پاچکی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے میں کسی بھی شعبے میں ترقی کے لیے علم اور تعلیم کی اہمیت بے حد بنیادی ہوچکی ہے، سیکولر شعبوں میں بھی اور مذہبی شعبوں میں بھی۔

تعلیم کی اِس اہمیت کا سبب موجودہ زمانے میں سائنس اور ٹکنالوجی کا فروغ ہے۔ جدید دَور میں سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں تمام علوم کو ازسرِ نو مدوّن کیا گیا ہے۔ مثلاً قدیم زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ آسمان کے ستارے اتنے ہی بڑے ہیں جتنے بڑے کہ وہ آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانے میں دور بینی مطالعے نے بتایا کہ آسمان کے ستارے بہت زیادہ بڑے ہیں، اور تعداد میں بھی وہ اس سے بہت زیادہ ہیں جتنا کہ بظاہر وہ دکھائی دیتے ہیں۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں بے شمار نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ نئی معلومات کی روشنی میں دنیا کو جاننے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ آج بے علم آدمی صرف ایک ناخواندہ انسان نہیں ہے، بلکہ وہ حقائق کی دنیا سے بے خبر انسان کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ٹکنالوجی کی ترقی نے قدیم روایتی دَور کو بالکل بدل دیا ہے۔ مثلاً قدیم زمانے میں سواری کا ذریعہ یہ تھا کہ جنگل میں خچر، گھوڑے اور اونٹ فطری طور پر بڑی تعداد میں موجود تھے۔ آدمی ان کو پکڑتا اور انھیں سواری اور بار برداری کے لیے استعمال کرتا۔ مگر آج سواری، مشینی سواریوں کا نام ہوگیا ہے، اور مشینی سواریاں علم کے بغیر نہ بنائی جاسکتی ہیں، اور نہ انھیں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قدیم زمانے میں کہا جاتا تھا کہ: **العلم علمان، علم الأدیان و علم الأبدان** ۔یعنی علم کی دو قسمیں ہیں، مذہب کا علم، اور علاج معالجے کا علم۔ مگر آج علم کی بے شمار نئی قسمیں وجود میں آچکی ہیں۔ ان علوم کو جانے بغیر کسی بھی شعبے میں ترقی کرنا ممکن نہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بہت سے وہ شہر جو قدیم زمانے میں دستی صنعت کے لیے مشہور تھے، اب وہاں ایک نیا دَور آچکا ہے۔ وہاں کے جن لوگوں نے جدید تعلیم حاصل کی وہ اپنی دست کاری میں نئے ٹکنکل طریقوں کو استعمال کرکے بہت آگے بڑھ گیے، اور جو لوگ روایتی علم پر باقی رہے وہ ترقی کی نئی دَوڑ میں دوسروں سے پیچھے ہوگیے۔ یہ منظر آج بہت سے شہروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سابق صدر امریکا، لنڈن جانسن نے کہا تھا کہ امریکا کی ترقی کے لیے تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی معاملہ ہر گروہ کا ہے۔ جو گروہ بھی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہے، اس کو یہ کرنا ہوگا کہ اپنی نسلوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنائے۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ موجودہ زمانے میں ترقی کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے: اول تعلیم، دوم تعلیم، سوم تعلیم، اور آخر میں پھر تعلیم۔

دوسری عالمی جنگ میں جاپان پوری طرح تباہ ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۶ میں جاپان کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ جاپان کی ازسرِ نوتعمیر کے لیے کیا کرے۔ جاپان کی قیادت نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں اپنی نئی نسلوں کو سب سے پہلے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے جاپان میں تیس سالہ تعلیمی منصوبہ بنایا گیا۔ جب یہ تیس سالہ منصوبہ پورا ہوا تو دنیا نے دیکھا کہ جاپان دوبارہ ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔

تعلیم کا مقصد صرف جاب حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلاشبہہ تعلیم کے ذریعے جاب بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن تعلیم ایک اور چیز کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ چیز جاب سے بھی زیادہ اہم ہے، اور وہ فکر وشعور کی ترقی ہے۔ تعلیم، آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ تعلیم آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے حالات کو بخوبی طور پر سمجھے، اور اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی گروہ کے لیے تعمیر وترقی کا سنگل پوائنٹ فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو تعلیم یا ایجوکیشن کہا جاتا ہے۔

۱۔ انڈیا ٹی وی (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر کرشنا موہن مشرا نے ۱۶ اگست ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر اِس بات سے تھا کہ مذہبی اختلافات کے بارے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ اسلام ہر حال میں امن چاہتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اختلافات کو برداشت کرو۔ اِس سے زیادہ اگر کچھ کرنا ہے تو پُرامن بات چیت (peaceful dialouge) کرو۔ اسلام میں تشدد کسی بھی حال میں جائز نہیں۔

۲۔ ڈنمارک کے ایک اخبار میں ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ کو پیغمبر اسلام کے بارے میں کچھ کارٹون شائع ہوئے۔ جس کے بعد ساری دنیا میں مسلمانوں نے سخت مظاہرہ کیا۔ اس سلسلے میں سعودی ٹیلی ویژن کی ایک ٹیم فروری ۲۰۰۷ کو ڈنمارک گئی۔ وہاں انھوں نے مختلف لوگوں کے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیے۔ اس سلسلے میں سعودی ٹیلی ویژن کی طرف سے اسلامی مرکز کے دفتر میں ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم سیرتِ رسول کے موضوع پر دو انگریزی کتابیں ڈنمارک لے جا کر وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو دینا چاہتے ہیں۔ کیرن آرم اسٹرانگ کی سیرت پر کتاب دو سو، اور اسلامی مرکز کی چھپی ہوئی کتاب پیغمبر انقلاب (انگریزی) دو سو۔ اس کے مطابق، ان کو پیغمبر انقلاب کی مطلوب کاپیاں بذریعہ ہوائی جہاز بھیج دی گئیں۔ ان کتابوں کو سعودی ٹیلی ویژن نے ڈنمارک میں تقسیم کیا۔

۳۔ نئی دہلی کے انگریزی میگزین لائف پازیٹیو کے زیرِ اہتمام انڈیا ہیبیٹیٹ سنٹر (نئی دہلی) میں ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اِس کا موضوع این لائٹن مینٹ (Enlightenment) تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی، اور اس کے آخری اجلاس ۵ دسمبر ۲۰۰۵ میں مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ این لائٹن مینٹ کے مختلف مفہوم ہیں — فلسفیانہ، مذہبی اور روحانی۔ لیکن روزمرہ کی زندگی کے اعتبار سے اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ آدمی ذہنی اعتبار سے اتنا زیادہ بیدار ہو چکا ہو کہ وہ منفی تجربے کو بدل کر اُسے مثبت تجربہ بنا سکے۔

۴۔ دوردرشن (نئی دہلی) نے صدر اسلامی مرکز کے ایک تفصیلی انٹرویو کی ویڈیو ریکارڈنگ کی۔ یہ ریکارڈنگ ۷ دسمبر ۲۰۰۵ کو دوردرشن کے اسٹوڈیو میں ہوئی۔ مسٹر راجیو مہروترا اس کے انٹرویور تھے۔ یہ انٹرویو پورے آدھ گھنٹے کا تھا۔ یہ پورا انٹرویو الرسالہ اور صاحبِ الرسالہ کے بارے میں تھا۔ سوالات کے دوران بتایا گیا کہ ہمارا مشن پیس اور اسپریچولٹی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے بارے میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ قرآن میں صرف اساسی تعلیمات ہیں۔ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسلام میں ہر وہ اجتہاد جائز ہے جو شریعت کی بنیادی تعلیمات سے نہ ٹکراتا ہو۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ فتویٰ کا مطلب شخصی رائے ہوتا ہے۔ فتویٰ کی حیثیت عدالتی حکم کی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ فتویٰ دینے میں مفتی غلطی بھی کر سکتا ہے۔ یہ تمام سوالات وجوابات انگریزی زبان میں تھے۔

۵۔ سپریم کورٹ آف انڈیا کے قانون داں حضرات کی ایک تنظیم سرچ (Search) کے نام سے قائم ہے۔ ۹ دسمبر ۲۰۰۵ کو اس کے تحت، انڈیا انٹرنیشنل میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کے صدر جسٹس کرشنا آئر تھے۔ اِس موقع پر

خطاب کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گی۔ اِس موقع پر انھوں نے پینتالیس منٹ کی ایک تقریر کی:

Image and Reality of Islam

تقریر کے بعد سوال و جواب ہوا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔

۶۔ آزادیٔ ہند (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان میں، خاص طور پر پنجاب اور ہریانہ کے علاقے میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گیے۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی اٹھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ کو وہ میوات کے علاقہ گھاسیڑہ گیے۔ یہاں اَطراف کے دس ہزار مسلمان اکھٹا ہوئے۔ مہاتما گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے کہ انڈیا آپ کا وطن ہے، آپ کو یہاں بے خوف ہوکر رہنا چاہیے۔ اس کے بعد مسلمانوں میں استحکام آ گیا۔ اِس تاریخی دن کی یاد میں ۱۹ دسمبر ۲۰۰۵ کو گھاسیڑہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا انتظام ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور مولانا شیر محمد امینی وغیرہ نے کیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی، اور امن اور اتحاد کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔

۷۔ ۲۲ دسمبر ۲۰۰۵ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (شعبۂ اردو) کے اسٹوڈیو میں صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے انٹرویور مسٹر انوار احمد تھے۔ آدھ گھنٹے کے اِس انٹرویو کا موضوع صدر اسلامی مرکز کی حیات اور اُن کا مشن تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کو عام طور پر ماڈرن مولوی سمجھا جاتا ہے، کیا یہ صحیح ہے۔ بتایا گیا کہ ماڈرن مولوی ایک صحیح چیز کا غلط نام ہے۔ اصل یہ ہے کہ حدیث کے مطابق، عالِم کو اپنے زمانے سے باخبر ہونا چاہیے (أن یکون بصیراً بزمانہ) علماء عام طور پر صرف مدرسے کی تعلیم پر اکتفاء کرتے ہیں۔ میں نے یہ کیا کہ مدرسے کی باقاعدہ تعلیم کے بعد پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھی اور پھر جدید علوم کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد میں نے اسلام کی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ جدید ذہن کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ اعتماد ہو سکے۔

۸۔ ۹ جنوری اور ۱۰ جنوری ۲۰۰۶ کو حج اور عید الاضحیٰ کے تعلق سے کئی ٹی وی چینل نے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا— اسٹار نیوز، دور درشن، آج تک، ای ٹی وی۔ دور درشن نے اپنے تین چینل کے لیے ریکارڈنگ کی۔ ہر انٹرویو میں حج اور عید الاضحیٰ کے بارے میں وضاحت کی گئی۔ انٹرویو میں بتایا گیا کہ یہ تہوار اِس لیے ہیں تاکہ عبادت اور قربانی اور انسانی قدروں کو لوگوں میں فروغ دیا جائے۔

۹۔ برون کمار (Mr. Barun Kumar) نئی دہلی میں ایم۔ اے۔ جنرل ازم کا کورس کر رہے ہیں۔ (Tel: 9873031260) انھوں نے یونیورسٹی پروگرام کے تحت، ۱۲ جنوری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ زمانے میں اسلام کی تصویر تشدد پسند مذہب کی ہوگئی ہے۔ اِس کا الزام عام طور پر میڈیا کو دیا جاتا ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس کے ذمے دار خود مسلمان ہیں۔ میڈیا، سنسنی خیز خبروں کو منتخب کرتا ہے۔ مسلمان اگر سنسنی خیز خبریں ظہور میں نہ لائیں تو ان کی رپورٹنگ بھی میڈیا میں نہیں ہوگی۔

۱۰۔سعودی عرب کے عربی روزنامہ عُکاظ کے نمائندہ فہیم الحامد نے ۱۸ جنوری ۲۰۰۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ایک سوال یہ تھا کہ ہمارا مرکز امن اور ٹررازم کے اِشو پر کیا کام کررہا ہے۔اِس سلسلے میں انھیں ضروری معلومات دی گئیں۔ایک اور سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ہندستان کی حکومت اور انڈین کمیونٹی دونوں حقیقت پسند لوگ ہیں۔اس لیے یہاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کوئی غیر ضروری مسئلہ نہیں۔ایک اور سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ سعودی کنگ کا سفرِ ہند نہایت مفید ثابت ہوگا۔اس سے انڈیا اور سعودی عرب کے تعلقات اور زیادہ بہتر ہو جائیں گے۔

۱۱۔ایک عرب میڈیا کمپنی (Al-baath, News Paper, Aleppo-Syria) کی ٹیم نے ۲۰ جنوری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔انٹرویور دکتور محمد بسّام النعسّان (Dr. M.B. Na'assan) تھے۔سعودی حکمراں ملک عبد اللہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۶ کو دہلی آنے والے ہیں۔اِسی نسبت سے یہ انٹرویو تھا۔مختلف سوالات کے جواب میں بتایا گیا کہ سعودی عرب اور انڈیا کے درمیان تعلقات بہت اچھے ہیں، اور اِس دَورے کے بعد یقینی طور پر اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ انڈیا میں سیکولر نظام ہے جو مسلمانوں کے لیے بہت مفید ہے۔اسلامی مرکز اور CPS اور الرسالہ مشن کے بارے میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ ہمارا مقصد اسلام کی پُر امن اور مثبت تعلیمات کا تعارف ہے۔ہندستان میں پُر امن اسلامی دعوت کے بہترین مواقع موجود ہیں۔اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم وسیع پیمانے پر اسلامی دعوت کا کام کررہے ہیں۔

۱۲۔ انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز، واردھا کے تحت، تعارفِ مذاہب کا ایک پروگرام ہوا۔اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔۲۵ جنوری ۲۰۰۶ کو پورا دن انھیں دیا گیا۔اس طرح اسلام کے تفصیلی تعارف کا موقع ملا۔یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔لوگوں نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا۔ایک صاحب نے کہا:

Today we have re-discovered the religion of Islam.

اِس موقع پر کامٹی کے حلقۂ الرسالہ سے بھی ملاقات ہوئی۔یہ لوگ کامٹی میں منظّم انداز میں دعوت کا کام کررہے ہیں۔ان لوگوں نے واردھا کے پروگرام کا مکمل ویڈیو ریکارڈ بھی تیار کیا۔اس سلسلے میں ایک دن ناگپور شہر میں گذرا۔یہاں بھی ملاقات اور گفتگو کے انداز میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور اسلام کے بارے میں سوالات کی وضاحت کا موقع ملا۔سفر میں ہر جگہ انگریزی لٹریچر بھی لوگوں کو دیا گیا۔انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو پروگرام ہو چکے ہیں۔موجودہ پروگرام اس نوعیت کا تیسرا پروگرام تھا۔پچھلے دونوں پروگراموں کی روداد سفرنامے کے تحت، الرسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔موجودہ پروگرام کی روداد بھی انشاء اللہ سفرنامے کے تحت، ماہ نامہ الرسالہ میں شائع کی جائے گی۔

۱۳۔نئی دہلی (پرگتی میدان) میں انٹرنیشنل بُک فئر ہوئی۔ وہ ۲۷ جنوری ۲۰۰۶ سے لے کر ۴ فروری ۲۰۰۶ تک جاری رہی۔ اِس بُک فئر میں گڈ ورڈ (Goodword) اور سی۔ پی۔ ایس۔ کی طرف سے اسٹال لگایا گیا۔ لوگ بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ سی۔ پی۔ ایس۔ کی ٹیم کے افراد ہر وقت وہاں موجود رہتے تھے۔ بڑے پیانے پر لوگوں سے اسلام کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا۔ لوگوں کو دعوتی بروشر تقسیم کیے گیے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے انگریزی اور اردو اور ہندی میں چھپی ہوئی اسلام پر کتابیں حاصل کیں۔ اِس موقع کے لیے خصوصی طور پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو شخص ایک سو روپیے کی کتابیں خریدے گا، اُس کو ماہ نامہ الرسالہ ایک سال کے لیے فری جاری کیا جائے گا۔ اِس اسکیم کے تحت بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ عام طور پر لوگوں نے سی۔ پی۔ ایس۔ کے مشن سے گہرا اتفاق ظاہر کیا۔ لوگوں کو جب سی۔ پی۔ ایس۔ کے دعوتی بروشر دئے گیے تو انھوں نے اُس کو اِس طرح لیا جیسے وہ اِسی کی تلاش میں تھے۔ غیر مسلم حضرات خصوصاً نوجوان مَردوں اور عورتوں نے انگریزی اور ہندی قرآن بہت بڑی تعداد میں حاصل کیے۔

۱۴۔ ورلڈ کاؤنسل آف ریلیجنس (World Council of Religious) کے زیرِ اہتمام ۲۹ جنوری ۲۰۰۶ کو ایک کنونشن ہوا۔ اس کنونشن کا انعقاد نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (روم نمبر ۲) میں کیا گیا۔ اِس میں مختلف بڑے مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Promoting Commonalities among diverse faiths for world peace.

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی، اور اسلام کی روشنی میں موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ اسلام کی تمام تعلیمات امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ کیوں کہ امن کے بغیر کوئی تعمیری کام نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کو کسی بھی حال میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں۔

۱۵۔ حسب معمول ۵ فروری ۲۰۰۶ کو اتوار کا اسپریچول کلاس ہوا۔ یہ کلاس نظام الدین ویسٹ مارکیٹ میں مرکز کی بلڈنگ میں ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ پابندی کے ساتھ جنوری ۲۰۰۱ سے جاری ہے۔ ۵ فروری کی کلاس کی حسب معمول ویڈیو ریکارڈنگ بھی ہوئی۔ اِس میں درس کا موضوع توحید تھا۔ اس میں سی۔ پی۔ ایس کا مشن اِن الفاظ میں بتایا گیا:

Our mission is to proclaim the glory of God

۵ فروری کے اسپریچول کلاس میں زیادہ لوگ آئے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حالیہ بک فئر کے موقع پر سی۔ پی۔ ایس کی ٹیم نے لوگوں کو ہفتے وار اسپریچول کلاس کا تعارف کرایا تھا، اور لوگوں کو دعوت دی تھی کہ وہ یہاں آسکتے ہیں۔ چناں چہ بہت سے نئے لوگ ۵ فروری کے کلاس میں شریک ہوئے۔

۱۶۔ ٹائم لائف (Time-Life) کے نمائندہ مسٹر احمد حسن قدوائی (Tel. 9873107411) نے ۶ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام میں عورت کے مقام کے بارے میں تھا۔ اس سلسلے میں انھیں قرآن اور حدیث کی روشنی میں ضروری معلومات دی گئیں۔

۱۷۔ دوردرشن (نئی دہلی) پَر ۹ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلام مرکز کی ایک تقریر لائیو ٹیلی کاسٹ کے تحت، نشر کی گئی۔ وہ ۱۰ محرم اور حضرت حسین کی یاد پر تھی۔ تقریر میں بتایا گیا کہ ۱۰ محرم ۶۱ ھجری کو حضرت حسین کی شہادت کی صورت میں جو واقعہ ہوا وہ تاریخی اعتبار سے خود حضرت حسین کی طرف سے کسی جارحیت کے سبب سے نہ تھا۔ حضرت حسین، پُر امن مشن کے تحت مکّہ سے روانہ ہوئے تھے۔ مگر کوفہ (عراق) کی سرحد پر شِبر بن جَوشن نے انھیں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس زمانے میں اگر ٹیلی فون موجود ہوتا تو یہ جنگ نہ ہوتی۔ کیوں کہ حضرت حسین یا یزید کی فوج کا افسر کوفہ سے دمشق ٹیلی فون کر کے یزید سے پوچھتا اور یزید یقینی طور پر ان کو جنگ سے روک دیتا۔ اِس جنگ کی یزید کو کوئی خبر نہ تھی۔ بعد کو جب اس کو خبر ملی تو اُس نے اِس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔

۱۸۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۶ کو حسب معمول اتوار کا اسپریچول کلاس ہوا۔ اب اِس کلاس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ حسب معمول اس کی ویڈیو ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ تقریر کا موضوع زکوٰۃ تھا۔ لوگوں نے بہت دل چسپی کے ساتھ سُنا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ زکوٰۃ کی مد میں سال میں ڈھائی فیصد کی رقم ایک علامتی چیز ہے۔ وسیع تر مفہوم میں زکوٰۃ زندگی کے کامل تزکیہ وتطہیر کا نام ہے۔ زکوٰۃ کا توسیعی پہلو قرآن کی ایک مکی سورہ میں اس طرح آیا ہے: **والذین هم للزكوة فاعلون** (المؤمنون: ۴)۔ اِس آیت میں **يؤدّون** کے بجائے **فاعلون** کا لفظ آیا ہے۔ یعنی تزکیہ کا فعل کرنا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایسے اسباب ہیں جو ہر وقت انسان کو آلودہ کرتے رہتے ہیں۔ اِس آلودگی سے بچا کر اپنے آپ کو مُزَکّٰی (پاکیزہ) بنانا، اسلامی زندگی کا اصل نشانہ ہے۔ زکوٰۃ اسی عمل کے لیے ایک علامتی فعل ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو دنیوی آلودگی سے بچائیں اور اپنے اندر پاکیزہ شخصیت کی تعمیر کریں وہی آخرت میں جنت کے مستحق قرار پائیں گے۔

۱۹۔ اسلامی مرکز میں ملک اور ملک کے باہر سے غیر مسلم افراد برابر آتے رہتے ہیں۔ اُنھیں اسلامی لٹریچر دیا جاتا ہے، اور اسلام کے موضوعات پر ان کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دیا جاتا ہے۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۶ کو حسب ذیل تین افراد مرکز میں آئے:

Brahma Rupa, U.S.a. (Tel: 989937114)

Jemal, Italy. (Tel: 9873239980)

Allon, Israel

پہلے دونوں صاحبان فی الحال گُڑگاؤں میں ہیں، ان لوگوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ ان کا ایک سوال خدا کے تصور کے بارے میں تھا۔ بتایا گیا کہ آرین مذاہب میں خدا کا تصور وحدتِ وجود (monoism) کے تصور پَر مبنی ہے۔ لیکن اسلام میں توحید (monotheism) کا تصور ہے۔ اِسی طرح جہاد کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ جہاد اصلاً پُر امن دعوتی جدوجہد کا نام ہے۔ موجودہ زمانے میں

اسلامی جہاد کے نام پر جو متشددانہ عمل کیا جارہا ہے اس کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اِسی طرح اسلام میں عورت کے مقام کے بارے میں ان کے سوالات کا جواب دیا گیا۔

۲۰۔ ٹائمس آف انڈیا (بمبئی) کی نمائندہ مسز بیلا جے سنگھانی نے ۱۵ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ڈنمارک کے اخبار Jyllands Posten میں شائع شدہ کارٹون (۳۰ ستمبر ۲۰۰۵) سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ اس قسم کے نزاعی مسائل پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس کو پُر امن انداز تک محدود رکھا جائے۔ کسی بھی حال میں تشدد کا طریقہ نہ اختیار کیا جائے۔ کارٹون کی حیثیت ایک تفنّن آمیز آئٹم (comic item) کی ہے۔ لوگ ایسی چیزوں کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتے۔ بالفرض اگر کچھ لوگوں کے نزدیک کارٹون قابل اعتراض تھا تب بھی اس کے لئے پُر شور احتجاج درست نہیں ہوسکتا۔ موجودہ زمانہ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ چنانچہ یہ کارٹون انٹرنٹ پر آ گیا۔ پہلے یہ قابلِ اعتراض آئٹم اگر ایک ملک کے تھوڑے سے لوگوں نے دیکھا تھا تو اب انٹرنٹ کے ذریعے وہ تمام دنیا کے لوگوں تک آ گیا۔

۲۱۔ بی بی سی لندن نے ۱۶ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو لندن اور دہلی کے درمیان ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو لینے والے مسٹر راجیش جوشی تھے۔ سوالات کا تعلق مسلمانانِ ہند کے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ تعلیم ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانوں کی بہبود کے لئے چودہ نکاتی پروگرام بنایا تھا۔ اب گورنمنٹ نے ۱۵ نکاتی پروگرام بنایا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس قسم کے پروگراموں کا کوئی خاص فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملے گا۔ مسلمانوں کی ترقی کا سنگل پائنٹ پروگرام تعلیم ہے۔ مسلمانوں میں اگر اچھی تعلیم آجائے تو بقیہ تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۲۲۔ سینئر انڈیا (Senior India) نئی دہلی کے نمائندہ مسٹر منوج کرشنا (Tel: 9868655357) نے ۱۶ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع تھا—— ہندستانی مسلمانوں میں تبدیلی کی لہر۔ سوالات کے دَوران بتایا گیا کہ آزادی کے بعد ہندستان کے مسلمان بے یقینی کی حالت میں مبتلا ہو گیے تھے۔ انھیں کوئی لائن آف ڈائریکشن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ۱۹۶۵ سے باقاعدہ طور پر اس معاملے میں مسلمانوں کو رہنمائی دینا شروع کی۔ لمبی جدوجہد کے بعد اب مسلمانوں میں بہت زیادہ شعوری بیداری آچکی ہے۔ پہلے وہ انڈیا کو ایک پرابلم کنٹری سمجھتے تھے۔ اب وہ اِس ملک کو مواقع کی سرزمین سمجھتے ہیں اور تعلیم وترقی کے ہر میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ مدارس کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ مدارس کے نظام میں بھی بدلاؤ شروع ہوگیا ہے۔ تقسیم کی تحریک کے نتیجے میں مسلمان علیحدگی کو بڑی چیز سمجھ بیٹھے تھے۔ اب وہ جان رہے ہیں کہ زندگی میں سب سے بڑی چیز انٹرایکشن اور مقابلہ ہے۔

۲۳۔ نئی دہلی کے اسٹار نیوز (ٹی وی) نے ۱۷ فروری ۲۰۰۶ کو صدر اسلامی مرکز کا دو انٹرویو لیا۔ ایک لائیو

ٹیلی کاسٹ کے تحت تھا، اور دوسرا اسلامی مرکز کے دفتر میں ویڈیو ریکارڈنگ کے طور پر۔ انٹرویور مسٹر راجیش کوشِک تھے۔ دونوں انٹرویو کا موضوع اُس کارٹون سے متعلق تھا جو ڈنمارک کے ایک اخبار میں ستمبر ۲۰۰۵ میں چھپا تھا۔ مختلف سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ اِس معاملے کا ایک پہلو وہ ہے جو نظری حیثیت رکھتا ہے، اور دوسرا پہلو وہ ہے جو طریقِ کار سے متعلق ہے۔ نظری حیثیت سے ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ جس چیز کو درست سمجھے اس کا اظہار کرے۔ یہ ہر فرد اور ہر گروہ کا حق ہے۔ اِس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کارٹون کے موضوع پر مظاہرہ کرنے والے اپنے حق کا استعمال کررہے ہیں۔ لیکن طریقِ کار کے معاملے میں کسی بھی فرد یا گروہ کو تشدد تک جانے کی اجازت نہیں، نہ براہِ راست طور پر اور نہ بالواسطہ طور پر۔ مثلاً یہ اعلان کرنا کہ جو شخص کارٹونسٹ کو مار ڈالے گا اس کو سونے میں تول دیا جائے گا۔ یا ایسے حالات پیدا کرنا کہ فائرنگ ہو اور بے گناہ لوگ مارے جائیں۔ بلڈنگ کو جلانا، اپنی آزادی کے نام پر دوسروں کی آزادی میں خلل ڈالنا وغیرہ۔ یہ سب انتہا پسندی کے طریقے ہیں۔ اور انتہا پسندی درست نہیں، نہ اسلام کے مطابق، اور نہ عقل کے مطابق۔

۲۴۔ ۱۹ فروری 2006 کو حسبِ معمول 1، نظام الدین ویسٹ مارکیٹ میں ہفتے وار اسپریچول کلاس ہوا۔ اس میں تقریر کا موضوع ڈنمارک کے اخبار میں شائع شدہ کارٹون کا مسئلہ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر میں بتایا گیا کہ کارٹون کے مسئلے پر مشتعل ہونا اور مظاہرے کرنا، اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں۔ اِس طرح کی چیزوں کو نظر انداز کرنا چاہیے نہ کہ ان کو لے کر پُرتشدد مظاہرے کیے جائیں۔ مسلمان ایک داعی گروہ کا نام ہے، اور داعی گروہ اِس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ ایسے مظاہرے کرے جس کے نتیجے میں داعی اور مدعو کے درمیان دوری پیدا ہوجائے اور اسلام لوگوں کی نظر میں ایک بدنام مذہب بن جائے۔ مزید بتایا گیا کہ ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب کے بعد جو تاریخی پراسس جاری ہوا، اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ دعوہ ورک کے نیے امکانات سامنے آگئے۔ اب ہمارا کام اِن امکانات کو استعمال کرنا ہے نہ کہ منفی کارروائیوں سے ماحول کو اتنا خراب کرنا کہ دعوہ ورک مشکل ہوجائے تقریر کے آخر میں آدھ گھنٹہ سوال اور جواب کے لیے دیا گیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ صبر واعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر ہم لوگ صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں تو لوگ اور زیادہ دلیر ہوجائیں گے اور ہم کو بزدل سمجھ لیں گے۔ جواب میں بتایا گیا کہ یہ سوچ صحیح نہیں ہے۔ صبر واعراض بے عملی کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منصوبہ بند عمل کا نام ہے۔ صبر واعراض کا مطلب اپنے لیے وقفۂ تعمیر حاصل کرنا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ رسول اور اصحابِ رسول نے اُس وقت صبر کا طریقہ اپنایا جب کہ وہ تعداد میں بہت کم تھے۔ آج مسلمان عددی اعتبار سے ایک بلین ہوگیے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں بھی صبر واعراض کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ جواب میں کہا گیا کہ یہ مسئلہ تعداد کا نہیں ہے بلکہ اصول کا ہے۔ صبر واعراض ایک ابدی اصول ہے وہ ہر حال میں اختیار کیا جائے گا خواہ مسلمانوں کی تعداد کم ہو یا زیادہ۔ جس طرح نماز ہر حال میں پڑھی جائے گی خواہ مسلمان کم ہوں یا زیادہ۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$10/£5
دو سال	Rs. 200	$20/£10
تین سال	Rs. 250	$30/£15